



کوشم خند



**PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani**

**Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081**



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»  
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ



# نظارے

کرشن چندر

پبلشرز، بکسٹون جنرل آرڈر پلانر

نئی دہلی ۲۰۰۰ چوک قیامی شہید بازار، لاہور

بکسٹون

بارادک ۲۰ ستمبر ۱۹۶۸ء

اہتمام : شاہد حمید شفیقہ الرحمٰن  
 آرٹس : خیال آرٹس سٹوڈیو لاہور  
 مینجر : طفیلہ آرٹس پرنٹرز لاہور  
 قیمت : بارہ روپے پچاس پے

بک کارنر پبلشرز سٹیشنرز بسینرز،  
 چوک فیصل شہید جہلم شہر فون ۲۸۸۵

# رقہ رقتہ

۷	جنت اور جہنم
۳۲	بے رنگ و بو
۴۶	آنسوؤں والی
۶۰	بچپن
۸۰	گلفرویش
۱۰۰	دو فرلانگ لمبی سڑک
۱۱۴	ہند والی
۱۳۱	ویکھی نیٹر
۱۴۹	خوفِ بناچ
۱۶۰	دل کا چراغ
۱۶۸	سفید پھول
۱۹۶	تلاش

# جنت اور جہنم

زنجی کے متعلق میں کیا جانتا ہوں، یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ  
 سکتا۔ انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مدوجزر کی طرح دل کے ساحل پر  
 آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور عموماً  
 یہ مبہم ہی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے جی میں لیں فنا ہو جاتی ہیں کہ  
 پھر کوئی ان کا نام و نشان بھی نہیں پاسکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تازہ نو  
 اور حسن استنہاج سے نئی جہلیاں فی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش  
 میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرہ گنگا اٹھتا ہے۔  
 کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی۔ یا فیضِ حیات کبھی

ایک اضطرابی کیلئے ہے۔  
 لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائدار اور مبہم نہیں ہوتے اور وہ



ساحل حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں۔  
 ایسی ہی تصویروں میں سے ایک تصویر زینتی کی بھی ہے اور  
 دراصل ایک ہی نہیں بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینتی کا خیال آتا ہے  
 تو بیک وقت اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں، تین  
 مختلف تصاویر تین مختلف لمحے، نگاہ کے تین مختلف زاویے جس  
 طرح سات رنگوں سے مل کر قوس قزح بنتی ہے ایسی طرح ان تین تصاویر  
 کی ترتیب سے زینتی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے لیکن یہ زندگی قوس  
 قزح سے بہت مختلف ہے کہیں مختلف !

دیکھنے میں تو زینتی قوس قزح کی طرح ہی حسین تھی۔ میں نے  
 جب پہلے پہل اُسے دیکھا تو اس وقت میں سات پولوں والے شہر  
 کے سب سے خوبصورت پل امیر اکدل پر جھکا ہوا بھلم کی سطح پر تیرتی  
 ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں ہی بیکار سا، آوارہ سا، اکتایا ہوا،  
 سری نگر کی دھبپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا۔  
 شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پرے  
 ایک طرف کو ہٹے ہوئے تھے۔ اور ان میں کہیں موٹے موٹے  
 مردوں کیساتھ پری دش عورتیں سوار تھیں۔ بن کے چہرے اور جھجک  
 ملائی آویزے دھپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے۔

کہیں تو منہ و جیبہ نوجوانوں کے ہمراہ بھدی اور بیکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں، جو عورت جتنی زیادہ بد صورت تھی، وہ اتنا ہی اچھا اور بھڑکھلا لباس پہنے تھی۔ دراصل پردے کی رسم تو ان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی۔ اور ان کے شوہروں کے چہرے کم از کم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔

بیمارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آواز میں ہنس ہنس کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم از کم مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی۔ شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر کوئل کا ننگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔

شکارے خوبصورت اور بد صورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بے چینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا۔ وہ پانی کی سطح پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے لال لال پردے ملتے ہوئے دکھائی دیتے۔ بھدی شکلیں حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، قہقہے اور ہانپنوں کے گیت ایک

ہی نغمہ بن جاتے اور وہ شکارے دربار ہال کے سامنے اس کے سفید  
 سفید ستونوں کے قریب پہنچ کر شہر ونیس کا سانپا رہ پیش کرتے ہوئے  
 یک سخت موڑ پر غائب ہو جاتے، لیکن یہ حرکت، یہ زندگی ان لمبے لمبے  
 دم درجے کے ڈونگوں یا ہوس بوٹوں میں دھنسی جو پانی کی سطح پر چپ  
 چاپ بننا بلخوں کی طرح تیر رہے تھے۔ ان کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن  
 پرے آویزاں تھے۔ صرف ایک ہوس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔  
 کھڑکی کے دونوں طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی سو میٹر بن  
 رہی تھیں۔ کیا یہ لوگ سری نگو میں سو میٹر بننے کیلئے آتے ہیں یا میری  
 طرح پل کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنے کیلئے؟  
 اور پھر مجھے اس رقت رنجی دکھائی دی۔ جہلم کے پانی کا ایک  
 ہی ریلواؤں سے میرے دل کے ساحل کے قریب گھینچ لایا۔ وہ ایک چھوٹے  
 سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی کشتی کا رخ بدل رہی تھی۔ رخ بدلنے  
 کا چو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور چاندی کا ایک ٹھمکا۔ اس کے کان میں  
 کسی خاموش نغمے کی گت پر لوزا ہوا سلوم ہوتا تھا۔ پھر جیسے وہ بجلی کی  
 تیز کی طرح پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سر  
 نظر آیا۔ یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے  
 کو کھینچ رہا تھا۔ اس کا گول سر رخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی،

بھی پل کے نیچے غائب ہو گئی۔ اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پل کی دوسری جانب آچکے تھے۔ وہ ڈونگے کو چغلے گھاٹ پر لگانے کے لئے رخ بدل رہے تھے۔ ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے گمن پٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا جو دھوپ میں چمکتے ہوئے ٹیلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آ رہا تھا۔

"THE HEAVEN" "جنت" یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہو گا۔

جنت اب چغلے گھاٹ کے قریب آرہی تھی۔ اس کے ڈرائیگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا۔ "TO LET" "جنت کرائے کیلئے خالی تھی۔ میں جنگلے سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نیچی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ مٹا میرے دل میں ایک خیال آیا۔ اور میں ایک تیزی سے امیر اکدل کے پل سے گزرتا ہوا چغلے گھاٹ کی سیریسوں کی طرف چلا گیا۔

زینچی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے ایک عجیب جھبک اور ایک عجیب جھباکی کے ساتھ

نکستی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اور چھوٹے لڑکے سے بولی۔

• عزیزیا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ •

عزیزیا ہنستا ہوا اٹھا۔ وہ یونہی ہنس رہا تھا بغیر کسی وجہ کے، کٹیری لڑکھن کی طرح، اس کے دانت جو ٹوٹے پیٹ کے استعمال کے نتیجہ پر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے اس کے سرخ ہونٹوں کے درمیان ہونٹوں کی لڑنی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی لڑپی سر سے اُتار کر بے پردائی سے زینتی کے قدموں میں چپک دی۔ اور پھر زینتی نے جس ملائمت اور ملاحظت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے۔ اسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس کی آنکھیں عزیزیا کی اس محسوس شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیل پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے اور جب میں عزیزیا کے ساتھ ڈرائیگ روم میں جنسل ہوا تو زینتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔ عزیزیا کہنے لگا۔ • یہ ڈرائیگ روم ہے۔ یہ اس

طرت آئینہ والا میز ہے، یہ لکھنے کا میز۔

اور میں نے عزیزیا سے پوچھا۔ • کیا یہ ہوس بوٹ

تھا ہے اور وہ لڑکی کون ہے ؟ •

• وہ • عزیزیا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے

ہوئے کہا۔ " وہ زینتی ہے میری خالہ، یہ بوس بوٹ زینتی کے غاوند کا ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں سو پور گیا ہے۔ یہ اس الماری میں چینی کے برتن، دوسیٹ، چمچے، پرچیں، یہ کھانے کے برتن، دو گیس لمپ۔ " اچھا، اچھا، آگے چلو۔ "

" یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے ان میں اپنا بنگلہ آسکتے ہیں۔ میں اور زینتی اس کمرے میں رہتے ہیں، وہ چھٹا سا کمرہ، جو کچن کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔ " اچھا چلو کچن دکھاؤ۔ "

سب کچھ دیکھ لیا، اس چھوٹے سے روم درجے کے ڈونگے کو جسے زینتی اور عزتیا خیر لہجہ میں اپنا بوس بوٹ کہتے تھے۔ زینتی اور عزتیا کے ہونے والے "صاحب" نے جسے پنجاب میں اس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے "لگڑ بگڑ یا چرخ" کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینتی کو بار بار دیکھ کر اس کے دل کی پیاس بجھی۔

" زینتی ! " میں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اڑاتے ہوئے پوچھا۔ اس — زینتی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس بوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا ؟ "

زینبی نے اپنی باریک آواز میں کہا : کیا صاحب یہیں رہیں گے ؟  
 " ہاں ، ہاں اسی بڑے میں ۔ "

تب یہ کرائے کیلئے خالی نہیں ۔ "

" اے ۔ ۔ ۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا

وہ کیوں ؟ "

عزیزا ہنستے ہوئے بولا : " صاحب یہیں دُور جانا ہے ۔  
 دراصل میں سو پور جانا ہے ، مگر راستے میں دُور آئے گی ، بھیل  
 دُور اور مانس جل ، ہم یہ ڈونگا لے کر سو پور جائیں گے جہاں زینبی کا  
 گھر والا آگیا ہے ، پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے اگر صاحب  
 کو دُور دیکھنا ہے ، تو منظور ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی  
 تھوڑا ہو گا ۔ اگر صاحب کو ادھر ہی رہنا ہے تو پھر ہم مجھ میں ۔ "

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچا رہا ۔ عزیزا کا ہنستا ہوا محسوس  
 سا چہرہ بہت پُر امید تھا ۔ گویا وہ ملجیا نہ انداز میں کہہ رہا تھا ۔  
 " چلو صاحب ، دُور دیکھنے چلو صاحب ۔ "

میں نے زینبی کی طرف دیکھا ۔ زینبی کا چہرہ آغل کی اوٹ  
 میں تھا ۔ کیا وہ بھی اپنے غاندے سے ملنے کیلئے بیقرار تھی ۔ اور تو ۔  
 اے شاعر مزاج آوارہ سیاح ! تو اس خطرناک مشن کو کیوں

پورا کرنا چاہتا ہے ؟ ہوس کے غلام کیا ترے لئے اس دنیا میں کوئی  
اور کام نہیں ؟ کوئی آرزو کوئی ملے نظر نہیں ؟

لیکن دل کے ساحل پر اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی  
ہلکی اور لطیف ہوتی ہیں ، آئیں اور چلی گئیں ، اور ساحل کی ریت اپنے پھکتے  
ہوئے لاکھوں قدروں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے ۔  
میں نے آہستہ سے کہا : ” اچھا عزیزا آج شام کو تم اس  
ہوس بوٹ کو امیر اکدل کے سامنے — اس گھاٹ پر لے  
آنا۔ کل ہم دوڑ چلیں گے ۔ “

” بہت اچھا صاحب ۔ “

عزیزا نے پرستہ لہجہ میں کہا :

زمینی کا چہرہ بدستور آغل کی اوٹ میں تھا ۔



جہری سنگم ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے وہاں میں  
 ٹھہرا ہوا تھا) راستہ بھر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا۔ حسن کیا ہے  
 اور انسان بد صورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ حسین  
 پھول جب مرجھا جاتا ہے تو اُسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے  
 ہیں؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جنم کے بعد آپ کی تعریفی  
 لگا ہوں کی مستحق نہیں رہتی؟ یہ کیوں کرتا ہے کہ ایک تومند کسان  
 دن بھر ایمان داری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو  
 یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کیلئے نان و نفقہ مہیا نہیں  
 کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ جس میں جو اپنے گناہوں اور اذیتوں  
 کا بارِ گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چوڑ کر اس

دلفریب دادی میں جنت کے مزے لوٹنے کیلئے آجاتے ہیں اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتیا لی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہیں چھین لیں گے؟ تقدیر؟ تناسخ؟ رونا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حقائق ہیں ان کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے؟ کیا یہی کافی نہیں کہ زینتی حسین ہے اور اس کا خاندان سلوہد گیا ہوا ہے اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر ڈولہ دیکھنے بارہے ہیں؟

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رلے سے متفق نظر آتے تھے۔ گو بخش اپنی داڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا۔  
 "میں بھی چلوں گا۔"

بھتیلال بولا: میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گزر ہی جائیں گے۔ اور آخر اب یہاں سرینگر میں رکھا ہی کیا ہے کیوں سرفراز؟  
 میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

عمود بولا: "کیوں جی میں بھی چلوں؟"

اب رہ گئے اندر اور متل، وہ دونوں بند کی طرٹ سیر کو گھنے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ شیر آکر زندگی کی حقائق پر غور کرنا، ہنسی سب سے بڑی

حماقت ہے اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی دُور کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔  
گور بخش نے کہا۔

”آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب  
رے چلو۔ ہارنیم، جلد، گراموفن، کیمرہ، دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے، کیک  
پھل اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے لئے حجامت کا سامان  
بھی لیتے چلو، اور ہاں بھی سرفراز، تم وہاں سے اس کم بخت ڈونگے  
والے ہی کو بلالالتے۔ اسی سے یہ سامان اٹھا کر لے جانے کو کہتے۔  
کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے  
بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے۔“

”لڑکی۔؟“ سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

”برس پندہ یا کہ سولہ کا سن۔“

لیکن انہوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا، دوسرا مصرعہ  
زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے  
”ابے اوگاؤ دی۔“ ابے گڑ بگڑ یا چرخ۔ اس کا نام کیا ہے  
”بھل کیسی ہے؟“ پھر جی بتاتے ہو یا اپنا گلہ دہاؤ گے؟“

میں سرنگھڑ سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے اور

اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مائل و سہجے تھے، وِزرات  
کھانے پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا۔  
ہاں کبھی کبھی بُرج کھیلنے اور کبھی کبھی م

ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا جا رہا تھا۔ محمود  
اکثر مدبرین لگاے مان دوڑ کے اور بلند سلسلہ ڈائے کوہ کی طرف  
دیکھتا رہتا۔ جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔

گورنمنٹ ہارمونیوم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے  
سر ملی تانیں نکالتا اور بھیا لال اپنے دبے پتے جسم اور لمبے قد کے  
ساتھ بار بار ڈونگے کی چٹ کو ہاتھ لگا کر ہم کو تاء قدوں کی تفصیک  
کر کے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا —

اور زنجی، لیکن زنجی کے تو ہم سب پرستار تھے، گو میں اپنا حق سب  
پر خالق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اسی طرح واضح  
کر دی تھی۔ لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چر یا کسی کے جال  
میں پھنسنے والی نہیں،

اس کی ادائیں دِلِ باقیں، اس کے گیت دکھن، اسکی  
مکراہٹ دل افزا، لیکن اسے اپنے خاندان سے محبت تھی اُسے

اپنے خاوند پر ناز تھا جو سوپر میں تکلیفیں معاش میں مصروف تھا۔ جب وہ چوہ چلاتے چلاتے یکایک منس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کیلئے نہ ہوتی۔ عزیز اکیلے ہی نہیں، جو اُسے اتنا پیارا تھا۔ پھر کبھی چوہ ہاتھ سے چوڑ کر سیدی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی۔ اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی جدھر سوپر تھا۔ اس وقت گھر ٹش ایک بے سرے لہجے میں چلا اُٹھتا۔ "دلدار کھنداں والے دا — دلدار !"

بھیا لال نے تو پہلے دن ہی زینتی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔  
 "گو شکل و صورت سے تو میں روایتی مجنوں ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلیٰ مجھے محبت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کی کسی لیلے کو بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے "اے میری پہاڑی لیلے! گڈ بائی۔"

لیکن بھیا لال ہی پر کیا منحصر ہے، قرینا قرینا یہی حال ہر ایک کا تھا۔ شروع شروع میں گو ٹش نے زینتی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گھیت سنائے تھے۔ اور کمپن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھونتے بھونتے اسے مچھلیوں کی لپک پلیٹ بھی پیش کی تھی۔ اور کبھی کبھی اندرا دھڑل پھلوں کے ٹوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں پھرا کر اُسے دے دیا کرتے تھے اور ان کبھی کبھی ایک کے ٹکڑے بھی۔ لیکن اب

چند دن سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی۔ اور اب سب لوگ زینبی کو  
قریباً بھول گئے تھے۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا گانا ناچنا جہلم میں  
تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ ہر ایک چہرہ  
بشاش نظر آتا تھا، اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک  
کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وزن پہلے سے ڈگنا ہو گیا ہے۔  
بسیالال نے اپنی پتی کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

• ارے یار میں تو سپریم مونا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون بچے  
کمر کے گرد تنگ معلوم ہوتی ہے۔  
اندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔  
• مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے گال اب پہلے سے  
پچکے ہوئے نہیں رہے۔

• بتل بولا۔ • اب میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں  
تو مجھے اپنے چہرے پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔  
• محمود جو اشتر کی خیالات رکھتا تھا طنز یہ لہجہ میں بولا۔  
• ہاں، انقلاب آرہا ہے۔

انقلاب تو خیر ایک دراز کار بات تھی۔ لیکن اس میں

ٹھیک نہ تھا، کہ سو پور ضرور قریب آ رہا تھا۔ کل ڈالر اور پوسٹوں سو پور  
 اور پھر شاید زینتی کی یہ شلوخ ادا میں ہمیں عمر بھر متیسرے آسکیں گی۔ میں  
 کچن کے دروازے پر کھڑا ہو کر زینتی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ڈونگے  
 کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چپو سے گشتی کا رخ ٹھیک کر رہی تھی۔

ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزیزیا پسینے میں تریتر  
 ڈانڈ چلا رہا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا یہ چارہ غریب گیارہ سال  
 کا لڑکا لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچن کے  
 عقب میں جو کمرہ تھا۔ وہاں محمود سویا پڑا تھا۔ اور اس کے ہلکے ہلکے  
 خراثوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ کبھی کبھی ڈرائنگ  
 روم سے سنسی کی ایک بلند جع سنائی دیتی۔ اندر نے بزم کھیلتے وقت  
 مبلغ سے کام لیا ہوگا۔

زینتی نے کہا۔ : صاحب کل ہم وٹر پنچ پائیں گے۔  
 : جھیل وٹر کیا بہت خوبصورت ہے؟

زینتی سر ہلاتے ہوئے بولی : جی صاحب ! جد ہر نظر اٹھاؤ  
 پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک، چاروں طرف نیلا پانی اور پنچ میوے  
 کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھل کھلے ہوئے اور سری بٹ ناگ۔  
 : سری بٹ ناگ کیا؟

• بٹ ناگ دُتر کا دلیر تھے۔ دُتر کا بادشاہ ہے وہاں ہر ایک  
سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔  
• اور اگر وہ زندے ؟

• تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے۔

• اچھا..... تو کیا جھیل دُتر بہت خوبصورت ہوگی ؟

• صاحب خود دیکھ لیں گے۔

• تم سے بھی زیادہ خوبصورت ؟

میں نے زینچی کے قریب جا کر کہا۔

زینچی کا چہرہ جو پہلے ایک سیب کے پھول کی طرح تھا، اب  
ایک گلاب کا پھول بن گیا، اس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا۔

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا۔

اور زینچی کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور جذبات سے گلو گھر آواز میں کہا۔

• یہ لو اسے سری بٹ ناگ کی نذر کر دینا۔

چند لمے خاموشی رہی، پھر یک سخت زینچی چپو چھڑ کر تن کر

کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب

کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے

نوٹ کو زور سے اپنی سٹشی میں مسل ڈالا۔ اور پھر اسے تیزی سے پانی



میں پھینک دیا۔ زینبی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں  
نم دار ہو گئی تھیں اور بالوں کی ایک لٹ دابنے رخسار پر اتر آئی تھی۔

یہ زینبی کی دوسری تصویر ہے جو آج تک میرے ذہن میں  
محفوظ ہے۔ میں آج بھی آنکھیں بند کئے چشم تصور سے اسے ایک  
مشعلہ جوالہ کی طرح بھڑک اُٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک بچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا مجھ  
اور پشیمان، اپنی شکست کی زخمی تصویر، نوٹ پکڑ کاٹتا ہوا، پانی  
کی سلج پر بہہ رہا تھا۔ آخر اسے ایک مچلی نے نگل لیا۔

آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصہ میں شفق کی لالہ گول  
لہریں غائب ہو گئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چُن دی  
گئی۔ ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کہیں  
کیا تم زینبی کو بھی ایک مچلی سمجھتے تھے۔ وہ مچلی جو تھارے پانچ  
روپے کے نوٹ کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل  
جاتی۔ لیکن وہ پانی کی مچلی نہیں آدم کی اولاد ہے۔ آسے اپنے  
بے بڑے کی تیز ہے۔ وہ غریب ہے تو کیا ہوا وہ تمہارے روپوں  
کی محتاج نہیں۔ تم اسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے،  
دوسرے دن ہم نوٹر کے کنارے پہنچ گئے۔ اور ہم نے

اپنے ڈونگے کو وہاں بندھوایا جہاں دریا نے جہلم جھیل و تر میں داخل ہوتا ہے — حد نظر تک، سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اور دور بہت دور چاروں طرف ایک سلسلہ کوہ ایک ٹیلگوں دیوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچوں کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے کس سی نظر آرہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی۔ درخت اگرچہ ہوا زور کی چل رہی ہوتی، تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا۔ اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

لیکن اگرچہ سہ سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے، ہوا بالکل ساکن رہی اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک، ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا بجنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بنانا ہوا گھوم رہا تھا اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن ہم نے کشتی کے ملاحوں کے کہنے پر بھی موٹر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پسہ تک نہ روکنا گوارا نہ کیا۔ اور پھر سہم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھٹا سا بجنور تھا اور پہلے

بھنور سے قریب چار میل کی دوری پر واقع تھا۔ البتہ یہاں گھبراہٹ نے جو تیز ناکم جانتا تھا۔ ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں جو خدا جانے کتنے آدمیوں سے بھوکا تھا۔ کیونکہ ملاح کے کچنے پر ہیں معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینے پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا۔ جو اس جیل میں کشتی چلاتے چلاتے ان طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھی۔

سوپہر کے بعد جب ہم جیل کی سیر سے لوٹے تو زین اور عزیزا دونوں کو زار و قطار روئے ہوئے پایا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ زین کا خاندان سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے۔ روزگار کی تلاش میں۔ ایک آدمی سوپور سے آیا تھا۔ وہ ادھر سے گزر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا۔

ہم نے زین اور عزیزا کو جہاں تک ہو سکا تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے۔ اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی۔ یہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بیوقوف کشمیری کو

اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا ؟ پنجاب میں اسے  
کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا ؟

گدھے ؟ بیوقوف غریب، ان میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی  
مض بوجہ آشنا جانتے ہیں، پھر وہ کی طرح، انہیں انسان سمجھنا ہی نہایت  
ہے۔ ان کیساتھ پھر وہں کا سا ہی سلوک ہونا پڑیے۔ غریب لوگ غریب  
ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام کرتے ہیں۔ اگر انہیں پیٹ بھر کر کھانا  
ملنے لگے تو اکر جاتے ہیں۔ غرض کہ طبیعت بہت منقطع رہی۔

ہم سب لوگ اپنے آپ کو تصور دار سمجھ رہے تھے۔ اور  
یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد  
بھیا لال کے لطیفوں سے طبیعت کھی تندرہلی۔ گو بخش نے گرامفون  
پر چند دھن ریکاڈ سنائے۔ اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گوبخ  
اٹھی۔

دس بجے کے قریب جب برج ۰ شروع کی گئی، تو میں  
دوسرے کا بہانہ کر کے اُٹھ آیا۔ دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔  
پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا، پھر میں نے کچن میں جا کر پانی  
کا ایک گلاس پیا۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی۔ میں  
کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آ گیا۔

زینتی ہاتھ میں چوپلے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کی طیرت  
دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے  
قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا۔ نہیں، وہ رو رو کر سو گیا تھا۔ اس کی  
پکلوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے۔ اس کے لبوں سے  
اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔

اور زینتی ۔ وہ کیا سوچ رہی تھی ۔ کیا اس کی نظر  
 جھیل کی دستوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی  
 جہاں اس خالم پردیس میں شاید کسی لکڑی اور کوئلے کی دکان کے  
 آگے اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کی محنت و مشقت سے چڑ۔  
 ایک تنکے ہوئے نجر کی طرح ٹانپ روتا تھا۔ زینتی کا چہرہ ادا اس تھا۔ اس  
 آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہو  
 " زینتی ! میں نے آہستہ سے کہا۔  
 وہ خاموش بیٹھ رہی۔

" مجھے بہت افسوس ہے زینتی ۔ "  
 زینتی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا۔  
 " زینتی تم گھبراؤ نہیں ۔ میں نے آہستہ سے کہا۔  
 " صاحب ! اب ہم کیا کریں گے ؟ " زینتی نے گلو گھیر لہجہ میں  
 کہا۔ " اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں — ایک خاوند تھا۔ وہ پردیس  
 چلا گیا۔

" عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
 " میں عمدت ذات ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
 " اے اب کیا ہو گا ؟ "

زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اس کے قریب جا کھڑا  
 ہوا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔  
 ”کیوں گھبراتی ہو، زینی تمہارا خاوند ضرور پردیسیں سے واپس  
 آ جائے گا۔ اور —“

زینی نے روتے ہوئے کہا۔ ”صاحب میں مرجاؤں گی  
 اور چھوٹا عزیز یا بھی بھوکا مر جائے گا۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا۔“  
 ”مست گھبراؤ زینی، میں تمہارے لئے..... میرا مطلب  
 ہے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ہاں تم روتی کیوں ہو؟  
 میری اچھی زینی مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے سب سے اندازہ محبت  
 میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں.....“

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا  
 ایک نوٹ تھما دیا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند،  
 لپک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک  
 پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی کچھ گھٹی تیل ختم ہو چکا تھا اور پھر غریبوں کے  
 پاس سرمایہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح  
 میری آغوش میں گر پڑی۔ اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے  
 کو میرے بازوؤں میں چھپالیا — اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

پانڈ کا نگ بھیکا ڈر گیا تھا۔ سارے نام تھے۔ وہ جہلم کی  
 سلج پر باسی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتوں  
 کے قریب سے گزرتی ہوئی آئیں بھر رہی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر  
 اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا۔ صرف ڈرائنگ روم سے  
 گورنمنٹ کے گلے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر گلا  
 رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین اُست !!  
 ہمیں است وہیں است وہیں اُست !





بے رنگ و بو

سکھ دکاندار نے جو آٹا نون تیل بیچتا تھا۔ آہستہ سے کہا  
 • میرے مکان میں عورتی سی جگہ خالی ہے، آپ خود چل کر دیکھ  
 لیجئے۔ کرایہ بھی کم ہے صرف نو روپیہ مالانہ، میں خود آپ کے  
 ساتھ گلی میں چلتا ہوں۔“

سکھ دکاندار نے سائیکلوں کی دکان کے مستری کو آواز  
 دی :- اورھو ! اورھو ! ذرا میری دکان کا خیال رکھنا ۔  
 • کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب ۔“

سکھ دکاندار جہاں رہتا تھا وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک ہی  
 منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، میسرہویوں کے قریب ایک چھوٹا  
 سا تنگ کمرہ خالی تھا اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کھلتا ہوا

ایک پوٹا سا انگن۔

”بس، اس چوٹی سی جگہ کیلئے نو روپیہ مالدار کرایہ۔“

سکھ دکاندار نے ایک چٹکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”تو اور کیا، ہم بھی نو روپیہ ہی دیتے ہیں، پانی کے تل کا کرایہ

ٹاکر بارہ روپے ہو جاتے ہیں، مہینہ بھر میں بمشکل تیس پنیتیں روپیہ کما آ

ہوں، بارہ روپیہ مالک مکان کو دے دینا ہوں، آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب

کی نذر کرتا ہوں، آپ جانتے ہیں، بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس

روپے کچھ زیادہ نہیں، باقی..... باقی..... مشکل سے گزر جاتی ہے۔“

سکھ دکان دار کی زرد رو بوی انگنی پر دھلے ہوئے فراک ٹکانے

کو نکل۔ ایک بچہ اس کی دعوتی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا، ایک بچہ وہ گود

میں اٹھائے تھے جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتائے پکڑے

ہوئے تھا، ایک بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

سکھ دکان دار نے کھانتے ہوئے کہا، ”تو یہ گھر آپ —

آپ کو پسند نہیں؟“

”جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا — اس کمرے میں

اندھیرا بہت ہے۔“

سکھ دکاندار کی کھانسی تیز تر ہوتی گئی، آخر ٹرک ٹرک کر بولا۔

۔ ہاں ۔۔۔۔۔ اندھیرا ۔۔۔۔۔ اندھیرا، نورِ پے مارا  
میں اندھیرا ملے گا تو اور کیا روشنی مل سکتی ہے ۔



یگلی کچی عقی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دوسرے دروازے  
پھروں اور کھجیوں کو روکنے کیلئے جگہ جگہ قبضوں کی آوازیں، گراموفون  
کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدا، ایک مکان دیکھا، بیت بڑا مکان سرخ  
سیمٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے۔ صرف ایک  
حصہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا، خالی تھا کرایہ پندرہ روپے ۔

مجھ سے کسی نے کہا۔ ”مالک مکان عقب کی گلی میں رہتے  
ہیں۔ آپ ان سے معاملہ طے کر لیجئے۔“

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف ان کا  
مکان تھا۔ گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔  
نہتے ۔۔۔

۔ جی نہتے، آپ اس (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کمرے میں  
تشریف رکھتے ہیں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں بس میں ایک منٹ  
میں آجاؤں گا۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے۔“

دوسرے کمرے میں ایک تلک پرانی وضع کے صوفے پر جس پر نیلی چینٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ بالو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔  
 ”بچے زکام ہے معاف کیجئے گا میں اُٹھ نہیں سکتی۔“  
 مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور حشری شال کو اپنے گرد پیٹتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکرا کر کہا۔“ کوئی ہرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے۔“  
 ہم دونوں ہنسنے لگے، بالو صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔  
 ہمیں ہنستے ہوئے دیکھ کر ان کے منہ کی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔  
 ”آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟“ ان کے لہجہ میں خفیت سی درشتی تھی۔

”دیکھ لیا، پسند ہے۔“

”کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں۔“

”اچھی عادت ہے۔“

لیکن ”بالو صاحب“ میری بات پر ہنسنے نہیں۔ بولے  
 کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ  
 ہوں گے، آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی دیکھ  
 نامیاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔“

وہ ان دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پوری داستان گہریا۔  
 یہاں ۔ جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو ملکتی ہو سکتی ہے اور  
 نہ اسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے۔ اور جس عورت کے پاس نہ تھے نہیں  
 اس کا خاوند دوسرا بیاہ کر لیتا ہے اور اگر دوسری عورت بھی نہ تھے نہ بچے  
 تو قیسرا بیاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے انکار میں سر ہلایا۔  
 بابو نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ " معاف کیجئے  
 گا۔ یہ بہو بیٹیوں والا حملہ ہے ۔ "

بابو کی بیوی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں کمرے سے  
 باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے  
 کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال تمٹما گئے۔ اونچی آواز میں بولی ۔  
 " دے منڈو جلدی کرو کا بج دیر ہو گئی ۔ "

آیا بی بی جی ۔ نوکر ہنستا ہوا میٹرھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔  
 کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا، جیگی بیگی میس سڈول اعضاء



یہاں ریت اڑ رہی تھی۔ اور شہد چاہتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے۔ ننھی مٹی لڑکیاں ریت پر لمبوں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یا ایک لمبی سی پر کوہنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ جھنجھٹے ہوئے بیچنے والا یا س انجیز نگاہوں سے بچوں کی سیٹرن دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس ریتے میدان سے پرے دور سامنے ایک مکان پر سونے حررت میں کھڑا تھا: کراہہ کیلئے خالی ہے۔

دروازہ کھلا تھا، ایک چھٹا سا والان، اس کے آگے کھڑا، آٹھن، جس میں پانی کے ٹل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بد صورت فرباندام عورت نہا رہی تھی۔ بغیر کسی جھجک کے بولی: "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں؟" میں نے دل میں کہا: "اور کیا تھیں دیکھنے آیا ہوں؟"

جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو۔ بولی: "اچھا آپ ذرا والان میں ٹھہریئے میں بھی آتی ہوں۔"

وہ ایک سفید و صوفی پہنے ہوئے آئی۔ یہ سونے کا کمرہ: یہ بیچک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے، ذرا نا صاف ہے لیکن کل تک بالکل — (سر ہلا کر) ہو جائے گی۔ کراہہ بیسپے ہم پیشگی لیتے ہیں۔ اچھے کراہے داروں کو دیتے ہیں۔ دوسری منزل میں ایک راستے صاحب کے گھر والے رہتے ہیں۔ ان کی تین لڑکیاں

ہیں، کالج میں پڑھتی ہیں، تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی اور بچے . . . . .

میں نے پوچھا: "اہ تیسری منزل سے اوپر؟"  
وہ حیران ہو کر بولی: "تیسری منزل سے اوپر؟ — اس سے  
اوپر چھت ہے، سونے کیلئے کھلی جگہ، اہ ایک طرف ریف حجابات  
کے لئے تین کمرے۔"

"ہوں! میں نے کمپن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا:  
"یہ فرش ذرا نامناسب ہے، کل تک — دس ہلکے —"  
پھر میری طرف دیکھ کر بولی: "آپ شادی شدہ ہیں نا؟"  
"نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہوئی، اور خالہ کی لڑکی اور  
خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔"

"اہ، اچھا — پھر تو ٹھیک سے لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔  
کم از کم ایک دو مہینوں کیلئے، کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے رخصت  
ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں، بہن تمہیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان  
اٹھانا پڑا۔"

اب یہ ایک نوجوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی



اپنے نقش تھے لیکن چہرہ کچھ اُترا ہوا کچھ اُدا ہوا، بڑی بڑی آنکھیں  
لیکن طول، رنجیدہ، لبوں پر جلی سی مسکراہٹ، لیکن پکی، تاسف انگیز  
گو یا کہہ رہی تھی، اس سے کیا فائدہ، وہ دن بھر دفتر میں کلر کی کرتے ہیں  
اور میں لبوں پر سرخی لگا کر برتن مانجھتی ہوں، آخر اس زندگی سے کیا فائدہ  
وہ شام کو نکلے ماندے آتے ہیں اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے  
ہیں اور رات کو — میرے لبوں کی سرخی دیکھتا ہی کون ہے ہٹے  
یہ زندگی کس قدر پکی اور بے مزہ ہے۔

”یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں“ مالکہ مکان نے مجھے بتایا  
ان کے — جلی کے دفتر میں نوکریں۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ”جی بہت اچھا، نصیحتے جی۔“  
کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا: ”آپ — یہ مکان  
کرایہ پر لے رہے ہیں۔“

”جی سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ غلام ہوں گی، غلام کی لڑکی  
غلام کی لڑکی کی لڑکیاں۔ اور . . . . .“

”تو ہرج ہی کیا ہے؟ اس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا:  
”مہرب بہنیں مل جل کر گزارہ کر لیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی جوتا ہے  
نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے۔“ اس نے کچن کے فرش کو پاؤں

سے بجاتے ہوئے کہا۔

”یہ فرش خدا کا صاف ہے۔ بد صورت خمر بہ اندام عورت

ایک کل کی طرح بول اٹھی۔ کل تک (سر ہلا کر) —

میں آہستہ آہستہ باہر والاں کی طرف مڑنے لگا۔ نوجوان عورت

کی آنکھیں کبہ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے لیتے۔ مجھے

متباری محبت تو درکار نہ تھی۔ اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی

نہیں کرتی لیکن یونہی دل پہلا رہتا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں صبح

سے شام تک۔ تم کبھی کبھی گنگنیدیں مجھے دیکھ دیا کرتے۔ اور میرے

لبوں کی سرخی چمک اٹھتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا، انسو یہ زندگی کتنی چمکی

اور بے رنگ دو ہوئے۔

”میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا، فستے۔

۔ فستے!“ دونوں عورتوں نے کہا۔

♦ ♦ ♦

ریتے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر

رہا تھا۔ کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، مجھے گزرتے دیکھ کر رُک گیا۔

”سلام صاحب۔“

”سلام! کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو؟“

”نہیں، صاحب، کٹھو کا گدی ہوں۔“

گورا رنگ، تنے ہوئے پٹھے، بہت سیلی بکڑ، پھٹی ہوئی قمیص  
کشادہ چھاتی، اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلھاری۔

”کٹھو، کٹھو؟“

”جی سرکار۔“

”بیوی ہے؟“

گدی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”جی سرکار۔“ بیوی کے  
نام پر ہر چند دستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، کیا ہوا اگر وہ  
غلام ہے کم از کم اس کا بھی تو ایک غلام ہے۔

گدی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اس کے  
بڑے بڑے میلے دانت سرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہوئے  
معلوم ہوتے تھے۔

”بچے بھی ہوں گے؟“

”جی سرکار ایک لڑکا ہے۔“ نچاسا (ہاتھ سے اشارہ کر  
کے، اتنا سا۔

”آغیں بھی ساتھ لائے ہو؟“

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو۔  
 اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلادیا۔ بولا۔ "صاحب کوئی کام  
 دیجئے میں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں۔"  
 "ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آندہ؟"  
 "ایک آندہ؟ صرف ایک آندہ؟ ارے — صرف ایک  
 آندہ؟ آدھے دن کی کٹائی۔"

"سرکار لوگ ایک آندہ بھی نہیں دیتے۔"  
 "تم واپس کلو تکب جاؤ گے؟"  
 لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا۔ ادھتہ پہنے گا شاید  
 وہ دھویں کے حلقوں میں گلوں کے سبز مرغزار، بر فانی چوٹیاں کالی  
 سیٹ کی چستوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے بچے کی تصاویر  
 دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔  
 "صاحب، کوئی کام بتائیے؟"

\*\*\*

شام کو میں پھر اپنے سرائے فائوہوسٹل کے دروازے پر

واپس پہنچ گیا۔ قید خانے کی طرح تنگ کمروں کی قطاریں، بجتی ہوئی پیاز کی بو، بڑے سے آگن میں بے ترتیبی سے پکے ہوئے پنچ، آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلا چلا کر کھڑا تھا۔

”ہم انقلاب چاہتے ہیں انقلاب، بورژوا، عمومی انقلاب اور پھر اشتراکی انقلاب اور پھر خالص سوسیڈی مارکسی انقلاب ہم ایک نئے تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بناء پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں ہم.....“ بیچارہ راج ہنس، مطبع کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

”میں پکارا۔“ او دینے! آج کیا پکا ہے؟“  
”ساگ، دال اور کانشی پل۔“

”نمبر میں رہنے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے ہاتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔“

راج ہنس اپنی پتی آواز میں اب تک چلا رہا تھا۔ ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اسے پیس کر دھر دیں گے۔ اس کے پرچے.....“

بھیالال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ادا اس لمبہ  
 میں پوچھا: تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے  
 جاؤ گے؟ اپنے سب رفیقوں کو؟  
 میں نے جواب دیا:۔  
 ”میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔“



# آنسوؤل والى

موسم دونوں تریٹ کے ڈاک بچکے میں آرام کریوں  
 پر لیٹے اؤنگھ رہے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور  
 بند درتے کے شیشوں میں سے میں برف کے ان بڑے بڑے  
 سفید گالوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت  
 تھے۔ اور نہایت خاموشی سے دریائے جہلم میں گر رہے تھے۔  
 جہلم میں پانی ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔ دریا کے کناروں پر درخت برف کا  
 سفید بادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف  
 ایک عجیب خاموشی، ایک گہرا سا ٹٹا چایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم  
 ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی پریوں کے ملک میں آگئے ہیں۔  
 میرا ساتھی جو انجینئر تھا۔ یکا یک آرام کرسی پر اٹھ بیٹھا



اور میری طرف جھک کر کہنے لگا۔ ”کیوں دوست کیا تمہیں جادو، سحر و افسوں اور اس قسم کی باتوں پر یقین ہے؟“

میں نے خوابیدہ انداز میں سر ہلادیا۔ انجینئر کا چہرہ مجھے بس مگر پُرمسرت آیام کی یاد سے جھک اٹھا۔  
اس نے ایک سنگار سے نکالیا اور کہتے لگا۔ میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

• ایک دفعہ مجھے سہرہ اور گائیاں کے درمیان جموں کے علاقے کھیٹرف، ایک خراب اور کچی سڑک کا معائنہ کرنے کیلئے جانا پڑا۔ یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر نئی نئی، بچائی گئی تھی۔ اور مجھے جلد از جلد معائنہ کر کے اس کے متعلق اپنے افسروں کو مطلع کرنا تھا کہ آیا یہ سڑک خشک موسم میں موٹروں کی آمد و رفت کے لئے موزوں ہے ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔

افسر لوگ بھی اس سڑک کے لئے بہت بے قرار نظر آتے تھے۔ کیوں کہ یہی وہ سڑک تھی جو گائیاں کی خاموشی اور پُر سکون وادی کو باہر کی دنیا اور اس کی تہذیب سے ملادیتی تھی۔ یہ سڑک کوئی ایک سو ستر میل لمبی ہوگی اور سہو سے گائیاں تک جاتی تھی۔ میں نے اپنا معائنہ سہرہ سے شروع کیا۔

سہرہ ایک خوشنما جگہ ہے۔ چوٹی چوٹی گول گول پہاڑیاں  
 چوٹیوں پر کہیں صنوبر کے درخت آسمان کی شفاف اور نیلی سطح پر سیاہ  
 سائے بناتے ہوئے، پہاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک سبز اور شاداب  
 سطح مرتفع اور اس پر چند ایک بھوری بھوری جھونپڑیاں جو آفتاب کی  
 کرنوں میں کندن کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہاں سہرہ واقعی ایک اچھی  
 جگہ تھی اور میں نے اسے بہت پسند کیا۔ سوائے سہرہ کی چنگی کے  
 جہاں کے افسر مجھے نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھے حق  
 کرنا ہی مناسب سمجھا کہ ایک محالدار مجھ سے کہنے لگا۔ صاحب آپ کے  
 اس ہیٹ پر بھی محسوس لگے گا۔ میں نے کہا:۔ "بھئی یہ تو پہننے کی چیز  
 ہے۔۔۔ وہ بولا۔۔۔ ہاں ہے تو سہی، لیکن بالکل نئی نظر آتی ہے۔  
 دراصل چنگی کے افسر پہننے کی چیز اسے سمجھتے ہیں جو نئی نہ دکھائی دے  
 نہ دھلائی گئی ہو، بلکہ اچھی خامی گندی اور ناصاف ہو۔ حصول صرف  
 اسی صورت میں معاف ہو سکتا ہے۔

خیر مہم سہرہ سے کوئی دس بجے کے قریب آگے  
 چلے، اب ہمارے سامنے وہ سڑک تھی۔ جو بیچ دربیچ بل کھاتی ہوئی  
 نئے اور اجنبی علاقوں میں سے گزرتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس  
 ہوا کہ میری کار بھی پہلی مرتبہ اس علاقے میں داخل ہو رہی تھی اور

اس سے مجھے یک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔

میں نے شو فر سے کہا۔ کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلائے۔ کیونکہ  
 اول تو مجھے معائنہ کرنا تھا۔ پھر سڑک بھی اکثر مقامات پر بہت تنگ  
 تھی۔ کہیں کہیں کناروں پر گہری کھائیاں آجاتی تھیں۔ جن کی طرف  
 دیکھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اور اکثر  
 موڑ بہت غلط طریق پر کئے ہوئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے  
 گئے۔ میلوں ہی آگے، سڑک کا مسابینہ کرتے ہوئے قدرت کی  
 دلغری بیوں کی بہار دیکھتے ہوئے۔ دور اوپر آسمان میں چلیں پر تولے  
 ہوئے گھم رہی تھیں۔ نیچے زمین پر لمبی لمبی گھیتیاں پہاڑوں کے دامن  
 سے شروع ہوتیں اور پھر کسی پرانے قلعے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر ہی  
 اوپر چڑھتی چلی جاتیں۔

کبھی کبھی کوئی دست کا درخت اپنے سرخ سرخ پھولوں  
 کی شمعیں لٹکائے ہماری موٹر کے قریب سے دوڑتا ہوا گزر جاتا۔  
 ایک جگہ ہیں ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنا پڑا۔ جہاں کم غت سب  
 انجینئر مل تو کیا ایک DIVERSION تک بنانا بھی بھول گیا تھا۔ ہم  
 نے اس چھوٹی سی شور مچاتی ہوئی ندی کو کار کی پوری رفتار سے عبور  
 کیا۔ پانی میں سے گزرتے وقت انجن سے نئے نئے لگنے لگے۔ اور

گاڑی کے پیسے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ناچتے ہوئے گزر گئے۔ موسم خزاں کا تھا لیکن یہاں کی خرواں بھی کتنی حسین تھی۔ کشمیر میں گامیاں سے زیادہ خوبصورت دادی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

میں نے خزاں میں بہار کے گیت گائے۔ میں نے اپنے

شوہر کو گاڑی اچھی طرح چلانے پر مبارکباد دی، میں نے —  
 یکا یک ایک دمچکا سا لگا، جس سے ساری کار کانپ اُٹھی۔ پھہ  
 ایک اور دمچکا اور اب کار وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ خاموش اور  
 چپ چاپ، صرف انہن ہی ایک پھڑپھڑے ہوئے بھیڑ کے پتے  
 کی طرح چلا رہا تھا۔

”ہم کار سے اُترے، میں اور میرا ہوشیار ڈرائیور ایک  
 اچھتی ہوئی نگاہ سے ہم نے دیکھ لیا کہ کار کو کیا حادثہ پیش آیا تھا  
 چپ چاپ یہ کم نجت پتی سڑک درمیان میں سے بیٹھ گئی تھی۔ اذ  
 کار کے پچھلے بائیں پہیے کو اپنی جگہ سے ہلا گئی تھی۔ میں نے ڈرائیو  
 کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمیں یہیں سڑی میں رات بھر ٹھہرنا  
 ہو گا۔ اتنا کہہ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اسی وقت مجھ پر وہ  
 احساس طاری ہوا جسے آپ سحر یا جادو یا انمول، جو جی پاسے کہ  
 کر پکار سکتے ہیں۔“

یہ ایک تنگ وادی تھی جس کے دونوں طرف نیم دائرو بنائے ہوئے اوپنے اوپنے پہاڑ کھڑے تھے۔ وادی کے مین درمیان پہاڑوں کو چیر کر ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ایک سونے کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمارے بالکل قریب ہی دیو وار اور شاہ بلوطا کے درخت کھڑے تھے۔ خاموش چپ چاپ، جھگل کے سپاہی جو شاید عشق و محبت کے وہ حیرناک فسانے سن رہے تھے جنہیں مغربی ہوائیں دور دور کے ملکوں سے اڑا کر لائی تھیں۔ پرے جھگل کے قریب ایک خوبصورت گھر تھا۔ پکنی مٹی کا بنا ہوا۔ اور سپید کھریا سے لپا ہوا۔ اس کے قریب ہی نیچے سڑک کی طرف، ایک عالی شان چنار اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ جس کے گھنے سائے میں ایک ٹھنڈا چشمہ لگنا رہا تھا۔

اس حسین منظر نے مجھ پر ایک۔ بخود کی کیفیت طاری کر دی۔ اور میں وہیں سڑک کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ پھر کیا ایک ڈرائیو کے یہ تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے۔

• صاحب افسوس ہے، مگر ہم آج آگے نہیں جا سکیں گے۔

میں نے یہ سن کر منہ موڑ لیا اور چشمہ کی طرف چل پڑا۔

چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور صاف تھا۔ میں نے ہاتھ مزہ دھویا

اور خوب سیر ہو کر پایا۔ اس کی جاں بخش تازگی نے اس درد کو بھی دور کر دیا جو سفر کی تنہاں کیونکہ میری کھن ٹپیوں میں پیدا ہو گیا تھا۔  
 "پانی ٹھنڈا ہے راجی۔" ایک نازک آواز آئی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک عورت تھی جو اپنے داہنے بازو اور کمر کے درمیان ایک مٹی کی ٹھلیا تھاے تھی۔ اس طرح جیسے کوئی ماں اپنے ننھے ننھے بچے کو تھاے ہوئے ہو۔ وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک وحشی ہرنی کی طرح یہاں چشے کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ایک ہرنی کی سی وحشت اور نرمی پائی جاتی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تعظیم کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "جی ہاں پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے ایسا چشمہ تو میں نے اس علاقے میں کہیں نہیں دیکھا۔"

اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر ہلکا کر بولی۔ "تم مجھے اس علاقے کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے؟" میں نے مسکین لہجے میں کہا۔ "کاش کہ ایسا ہوتا۔"

اس کے پتے پتے لبوں پر ایک لوزش سی پیدا ہوئی کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے جو اس جنگل کا رہنے والا نہیں ہے وہ

اس جگل کا رہنے والا کیسے ہو سکتا ہے ؟  
 میں نے شرم سے اپنا سر جھکایا اور اس کے نازک  
 ٹخنوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے نیچے پاؤں کی طرف بلاشبہ  
 میں اس جگل کا رہنے والا نہیں تھا۔

وہ کچھ عرصہ خاموش رہی۔ پھر اس نے نیچے سرک پر کھڑی  
 ہوئی کار دیکھ لی۔ " وہ کیا ہے، کیا یہ وہی چیز تو نہیں جس سے  
 متعلق میرے بابا نے کہا تھا کہ ایک دن یہاں آئے گی اور اس  
 سب علالت پر قبضہ کر لے گی۔ "

میں نے وحشی مہرئی کو سمجھانے کی کوشش کی  
 جب وہ میری باتیں سن چکی تو سر ہلا کر کہنے لگی، " اوں ہوں  
 یہ کوئی اچھی چیز نہیں، ایک گھوڑا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے مجھے  
 اس سے ڈر لگتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے دن آ رہے ہیں۔ "  
 یہ کہہ کر وہ چٹے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے مٹی کی ٹھلیا  
 کو چٹے میں پھینک دیا۔ اور اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے  
 اُسے نئے نئے بچکولے دینے لگی۔ جیسے کسی کھلونے سے  
 کھیل رہی ہو۔ اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں جیسے کوئی عجیب  
 سا پنا دیکھ رہی ہو۔ وہ کیا سوچ رہی تھی جگل کی حین شاعرو،

بب وہ اس طرح چٹھے کے کنارے اپنے خیالوں میں مست ٹھلایا  
 کو اپنی انگلیوں میں تھامے سوچ رہی تھی۔ تو کیا ایک سوچ کی آخری کرنیں  
 اس کے چہرے پر پڑیں، ان کندنی کروں کے جھلکاتے ہوئے ارغوانی  
 ہلے لے اس کے چہرے کو اور بھی حنین اور پُر اسرار بنا دیا۔ اور کیا ایک  
 بے احساس ہوا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ بلکہ خود جھگل کی دیوی  
 تھی۔ جسے ایک حقیر انسان نے دنیا نے جہذیب سے بہت دُور  
 ایک نیلے چٹھے کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ہاں وہ جھگل کی دیوی  
 ہی تو تھی۔ خوب صورت، پُر اسرار، وحشی، گمنام اور محسوس !  
 ٹھلایا دیر تک چٹھے میں ناچتی اور گنگناتی رہی۔ اور آخر کار  
 پانی سے بھر گئی پھر کھایا ایک اس کی مائیکہ بھی اپنی خوابوں کی دنیا سے  
 اس غیر دلچسپ اور بچکی دنیا میں لوٹ آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے ؟“

”اس نے جواب دیا۔ ”نیرا۔“ یہ کہہ کر اس نے نگاہیں  
 نیچی کر لیں اور ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ؟“ میں

نے اس سے کہا۔ آپ کا نام تو بہت اچھا ہے نیرا، نیرا یعنی  
 آنسوؤں والی، گو میں آپ میں رونے کی کوئی بھی کیفیت نہیں دیکھتا۔



سوائے آپ کی آنکھوں میں جن کی ملائت اقدہ نرمی کسی ہر فی کی آنکھوں کی یاد دلاتی ہے۔

اس پر وہ اور بھی شرمائی، شاید اپنی تعریف سن کر غم ہو گئی پھر وہ آہستہ سے کھڑی ہو گئی، اس نے ٹھلیا پانی سے نکال کر اپنے سر پر رکھ لی اور اپنے دونوں بازو اس کے نیچے باندھ لئے۔

میں نے آہستہ سے کہا: ”کیا ہمیں بات بسر کرنے کیلئے کوئی جگہ مل سکتی ہے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی میرا شوفر بھی میرے ساتھ ہی ہے۔“

نیرا نے فورا جواب دیا: ”کیوں نہیں، بینک میرے بابا آپ کو ضرور جگہ دیں گے، آئیے۔ گو ہم بہت غریب لوگ ہیں، لیکن یہاں او کوئی رہتا بھی نہیں، میرے ساتھ آئیے۔“

دو دن کے بعد محلے کے دھندلے میں، اسی سڑک کے کنارے میں اور نیرا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور نے آخر کار، کار کو درست کر لیا تھا اور اب ہم الوداع کہنے کیلئے تیار کھڑے تھے میں نے نیرا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور نہایت حسرت سے اُسے الوداع کہی، نیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاں وہ آنسوؤں والی مٹی، نیرا، دو دن ہم دونوں نے اکٹھے گزارے وہ ایک پاک

نصاف اور محصوم ہستی تھی، جیسے کہ صرف جنگل کے رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ دو دن، دو خوبصورت خوشیوں سے بھرے ہوئے دن میں نے نیرا اور اس کے والد جنگل کے لڑھے شکاری کی سادہ اور حسین زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ دو دن، جو سرت افروز لمحوں کی طرح جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان دو دنوں میں نیرا نے مجھے اپنے چھوٹے سے بانچے میں کھلے ہوئے پھول دکھائے، اپنی کیریاں، گائیں اور دھان کے کھیت اور میں نے؟ ————— میں نے اُسے جن رعبت کے انسانے سنائے اور سیاہ دلوں کی ابد فریبیاں بیان کیں۔ میں نے اُسے بہت سی باتوں کے متعلق خبردار کیا۔ کیونکہ وہ بہت ہی محصوم تھی۔ خطرناک حد تک محصوم، سب سے بڑھ کر میں نے اسے اس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ تہذیب جو اب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اس علاقے میں پھیلنے والی تھی وہ نہایت خاموشی سے میری باتوں کو سنتی، ایک آہ بھر کر میرا شکریہ ادا کرتی اور پھر چپ ہو جاتی۔ اور اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔

میں نے چوتھی بار اس سے کہا: "اچانیرا الوداع۔"

اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے کوٹ کو پکڑ لیا: مت

جاؤ، پرسی کیا تم ضرور چلے جاؤ گے؟

سچ پنج اس غریب لڑکی کو مجھ سے انس سا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ زم بے میں کہا: میں تم سے ملنے کیلئے آؤں گا۔ نیرا، ضرور، ہاں اب مجھے اجازت دو۔ اپنی دلکش مسکراہٹ کیساتھ مجھے الوداع کہو، نیرا۔

نیرا اپنے آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ سحر کے اڑتے ہوئے دھندلے میں میں نے دیکھا کہ نیرا کی پلکوں پر آنسو پھول کی پتیوں پر شبنم کے برتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے الوداع کہی اور پھر یک لخت منہ موڑ کر سامنے کی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔ اوپر اور اوپر، وہ گھاٹی کے اوپر چڑھتی گئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے نہ مڑ کر دیکھا۔ گھاٹی کی چوٹی پر سورج کی کرنوں نے اس کی پیشانی کو چھو لیا۔

اور اس کے گرد ایک حسین ہالہ بنا دیا۔ اب وہ گارہی تھی ایک میٹھا پھونڈ پہاڑی گیت جس کے الفاظ میرے کانوں نے نہ سنے، لیکن جس جانگھراؤ نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اس گیت کی وہ لہر، وہ اس کا لانا وال حسن۔

تڑپ اور درد آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے۔

انجینئر چپ ہو گیا، مگر میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی۔

آگ دم ہو چکی تھی اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے پناہ رہے تھے۔ بہت  
 دیر کے بعد میں نے آرام کر سی سے سر اٹھایا۔ اور انجینئر کی طرف مڑ کر  
 پوچھا کہ کیا تم پھر بھی میرا سے ملے ؟  
 لیکن انجینئر سو گیا تھا۔ اس کا سگارا اس کے ہاتھ کی انگلیوں  
 سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔ اور غایبچے پر بل کر رکھ ہو چکا تھا۔

...

بچپن

رفیع کو نیلا سے بہت محبت تھی، یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت  
 تھی۔ خوش نما رنگا رنگ تیسریوں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر اس کا دل  
 یکا یک بیتاب ہو جاتا۔ اور وہ ان کے پیچھے خوشی کی دھیانہ چمٹیں مارتا ہوا  
 پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا، اور جھٹ سے اپنے  
 پسندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لاجوردی رنگوں والی ایک تیسری کو اس  
 میں قید کر لیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پار بھری نگاہوں سے تیسری کی  
 طرف دیکھتا۔ اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں میں پکڑ کر ادھر ادھر  
 گھومتا۔ تیسری کے پر پھڑپھڑاتے اور یکا یک اس کا دل رحم کے جذبات  
 سے اتنا بھر جاتا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور وہ اُسے  
 ایک نعت چھوڑ دیتا۔ تیسری اڑتی ہوئی دور سونٹ کے پودوں سے پس

شفالوں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزریاتی۔

رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اڑتی ہوئی خوبصورت تیسری کیٹرن دیکھتا۔ کتنی اچھی تیسری تھی۔ محبت اور افسوس، یکا یک ایک اور تیسری، سبز اور پیلے پیلے پروں والی پہلی تیسری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں۔ سنگھد راج کے پھولوں کے اوپر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وہ اپنی چوٹی چوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چلا لگیں مارتا ہوا سنگھد راج کے تختوں کی طرف دوڑنے لگتا۔ اسے واقعی تیسریوں سے محبت تھی۔

اسے آڑوں سے بھی محبت تھی۔ اور سبوں سے بھی، اور لال لال رنگ کے مشرقی انگوروں سے بھی۔ جب درختوں پر سب سونے کے گیندوں کی طرح چمکتے اور لمبی لمبی سبز بیلوں میں پہاڑی انگور یا قوت کی طرح دیکھتے تو انہیں دیکھ کر رفیع کا دل کسی نامعلوم محوشی سے کانپنے لگتا۔ سرن دل ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بھی۔ وہ چاہتا کہ وہ جلد جلد درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے۔ اور ہر ایک آڑ کو اپنے بکتر کی نخی نخی جیبوں میں بھر لے۔ ہر سب کو، انگوروں کے ہر خوشے کو اپنے گالوں کے اندر یا شاید اپنے دل کے اندر چھپا لے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دنیا کا کوئی اور فرد اس کے سبوں یا آڑوں انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ اُسے یقیناً ان

سے محبت تھی اور بائع کے مال کی گویہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اور پھر اسے اپنی اتا سے محبت تھی۔ جب اماں اتا کو کبھی جھڑک دیتیں اور اتا اس سے مصرت بنائے آپٹل کے ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تو رفیع ادھر ادھر دیکھتا ہوا، سہم سہم کو قدم اٹھاتا ہوا چپکے سے اتا کے کمرے میں چلا جاتا۔ اور اتا کے سیاہ لہنگے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اداس، محسوم اور پیار بھری نگاہوں سے اپنی اتا کی طرف دیکھتا۔ وہ اتا کو چپ کرانا چاہتا۔ وہ اُسے ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا۔ پھر یکایک اس کا گلا بھر آتا اور اتا کو روتے دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا۔ پھر اتا اسے اپنی گود میں لے لیتی۔ اُسے اپنے بازوؤں میں زبردستی بچھ کر چھاتی سے لگا لیتی۔ اپنے گیلے زخماں اس کے نرم نرم گالوں سے لگا دیتی اس کا منہ اتنی بار چومتی کہ اس کا دم رکنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ اتا کی سسکیاں بند ہو جاتیں۔ اور اس کے آنسو خشک ہو جاتے ————— ہاں اُسے اپنی اتا سے محبت تھی۔

لیکن اتا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُسے اتنی اچھی نہیں لگتی تھی۔ امی تو اس کی جان تھی۔ لیکن وہ کیا کرے۔ اماں



ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھیں۔ ہاؤنٹے باغ میں کھیلو، جاؤنٹے سکول جاؤ۔ رفیع سیر کو جاؤ۔

وہ جب دیکھتا، امی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتیں۔ امی کچن میں جائیں تو وہ یہ بچھے بھاگتا۔ اور کروشیا یا سلاٹیاں لے کر بیٹھتیں تو وہ مومنے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور امی کے بالوں سے کھینچنے لگ جاتا۔ اماں بھڑک دیتیں۔ ”ننھے تم نے سب سے نہیں یاد کیا۔“ اور وہ سہم جاتا۔ ”جاؤ کام کرو۔“

اور وہ دیمے دیمے قدموں سے واپس چلا جاتا۔ اُسے تو اماں سے محبت تھی۔ لیکن اماں ہی اُسے ہر وقت پیار نہیں کرتی تھیں۔ جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ مچل جاتا اور بار بار اماں کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ لیکن اماں اسے یونہی چمکار کر کہہ دیتیں ”رفیع بیٹا باہر کھیلو۔“

اُن کبھی کبھی وہ اماں کی گھڑکیوں کی بھی پروا نہ نہیں کرتا تھا۔ اماں ملشتری اُٹھائے ہوئے ابا کیلئے کھانے کے کمرے میں تراشے ہوئے چل لے جا رہی ہوتیں کہ وہ ان کی ٹانگوں سے پٹ جاتا۔ شریر ننھے، شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ اردو کی تیسری کتاب اُٹھائے ہوئے اماں کے ارد گرد شور مچاتا

ہوا جاگتا اور اخیں ایک دم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا۔ ٹھک کر اور بار  
کر وہ اپنے بازوؤں میں اطالیتیں۔ اماں کی میٹھی اور مہربان نگاہیں  
دیکھ کر وہ ان کی گردن سے لپٹ جاتا۔ "میری اچی اتی۔"

وہ آبا جی کو بھی بہت چاہتا تھا اگرچہ اسے پتہ تھا کہ آبا بہت  
بڑے آدمی ہیں۔ اور نرم بچے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ  
اخیں بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ دور سے پر جاتے تو وہ ہمیشہ منہ کرتا۔  
"بچے بھی ساتھ چلو آبا اے چلو نا آبا۔ اچھے آبا جی،"

آبا جی۔"

لیکن ان منٹوں سماجوں کا آبا جی پر ہمیشہ کم اثر ہوتا تھا۔ اور  
تو اور وہ شام کو میسر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ  
چلے جایا کرتے۔ اور بیچارہ رفیع چیتا ہی رہتا۔ آبا دور سے  
واپس آتے تو وہ کتنی دیر پہلے ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر آبا کی  
راہ دیکھتا رہتا۔ اور جب آبا دور سے ہی گھوڑے پر سوار ہندے  
کے قریب کی گھونڈی پر نظر آجاتے۔ تو وہ فرط مسرت سے چلتا  
آٹھتا۔ آبا جی آئے۔ وہ آئے۔ وہ آئے، ہاں وہ آبا جی کو بہت  
چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اُسے نیلا سے ہی تھی۔ نیلا بیگم

فتح دین چہر اسی کی لڑکی تھی۔ عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی شاید اسی وجہ سے وہ چارے رفیع کی پرواہ تک نہ کرتی تھی ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو۔ لیکن اس کا رفیع کو پتہ نہ تھا۔

بہر حال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی۔ اتنی ہی نیلا اس سے بیگانہ تھی۔ اس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم ملے ہوں گے) تو سر اٹھا کر اپنے خوبصورت گونگر والے بالوں کو چٹکا کر اس کے پاس سے گزرجاتی۔ غریب رفیع کو اس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے قصبہ کے ہر ننھے گڈریے سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی۔ مگر چارے رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہ ہوئی تھی۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ رفیع کی محصوم زندگی میں چند ایک ہی ایسے تکلیف دہ طے آئے تھے۔ ورنہ دن بھر تو وہ نیلا کو کم و بیش یاد بھی نہ رکھتا تھا۔ سکول کی قید، ماسٹر کی ٹھہریاں حساب کے سوال جمع تفریق ضرب تقسیم، باغ میں اچھل کود، رات کو وہ جب شک کر بستر پر لیٹا تو بس پھر صبح اتنی ہی اُسے مشکل سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سامنے آباتی یا جب باغ میں پھولوں سے اکیلا کھیلنا کھیلنا اکتا جاتا۔ تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلالے، بھلا وہ اسے کیا کہے گی۔ اچھا تو بھلا وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔

ایک دن جب وہ یوں ہی کھیلنا کھیلنا ندی کے کنارے جلا گیا تھا۔ جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی۔ تو وہاں اس نے ایک تنگت کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے مہم بولی دیکھے۔ کئی پتلیاں بڑھا رہے تھے۔ کئی بانسریاں بجا رہے تھے۔ کئی بچھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس بلا رہے تھے۔ دو تین ندی کے کنارے بنا رہے تھے۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف منوہر صادق حسنی نوران کی تقری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے شیلے کھود کھود کر مالیشان محل بنا رہے تھے رقیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ ان میں نیلا بھی تھی۔ وہ بہت دیر تک ان کے ساتھ کھیلنا رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں

نہ اس نے نیلا سے بات کی۔ نیلا نے اس سے، کیلتے کیلتے نیلا  
 اور کیتھری جھولے کے قریب چلی گئیں۔ اور پنگ بڑھانے لگیں۔ رفیع  
 حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک کبھی پنگ نہ  
 بڑھائی تھی۔ اتنی ادنیٰ اُسے تو جھولے پر بیٹھنے سے بھی ڈر گتا تھا۔  
 صادق ہانسی بجا رہا تھا۔ رُک کر بولا: ”پنگ بڑھاؤ گے“  
 رفیع انکار نہ کر سکا۔ غصہ کر نیلا کے سامنے جو دوسرے  
 جھولے سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے جھولے پر چڑھا۔ لیکن اب اُسے  
 پنگ بڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ ناچار کہنے لگا: ”مجھے جھولا دو۔“  
 یس کر بہت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ رفیع کو ایسا  
 معلوم ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا  
 اور جھولے سے اتر کر سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا  
 رہا تھا۔ اسے کسی پر غصہ نہ تھا۔ صرف اُسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا  
 گھر پہنچتے پہنچتے اس کی سبکیاں تیز ہوتی گئیں۔ اور جب وہ دروازے  
 پہنچا کہ اندر داخل ہوا تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اُٹا نے پوچھا۔

”کیوں رو رہے ہو بیٹا؟“

• بیٹا رفیع کیا بات ہے ؟ •

• میرے رفیع کو کس نے مارا ہے ؟ •

• ننھے تم اتنی دیر کہاں کھلتے رہے یہاں بے چارا مالی

ڈیڑھ دو گھنٹے سے تماری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بولو  
رفیع ننھے ؟ •

لیکن ننھا رفیع دیر تک روتا رہا۔ آخر جب وہ چپ ہوا  
تو سسکیوں کے درمیان میں رُک رُک کر بولا۔

• میں ..... میں ..... ایک جھولا ....  
ایک جھولا لگوا دو اتنی •



**نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آئی کبھی امی سے مشائی**

لینے کیلئے، کبھی کوئی کپڑوں کا جوڑا لینے کیلئے، کبھی کچھ ہوتے  
آخر وٹ دینے کیلئے جو اس کے گھر کے آنگن میں اُٹھ جاتے  
درخت پر لگتے تھے۔ لیکن رفیع اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار  
رات کو سوتے وقت جب اتنا اُسے پریوں کی کہانیاں سناتی تو  
وہ سوچا کرتا کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہوا کرتی

ہیں لیکن یہ بات اتنا سے پوچھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ نیلا اسے ایک مدت کی طرح پیاری لگتی تھی۔ کبھی وہ سوچتا اس کے گال کتنے لال لال ہیں۔ اور اس کے ہونٹ اس کے اپنے گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا۔ اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے۔ تو کیا پھر بھی نیلا اس سے ذرا بڑے گی۔ یہ خیال اسے اس وقت آیا جب کہ وہ سنبلو کی ایک اونچی بھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہوئے سرخ سرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ ان سنبلوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا۔ سنبلو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبلو توڑ کر اپنے گالوں پر مل لئے۔ اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا۔ پھر یکا یک اُسے دوسری بھاڑی کے قریب ایک خوبصورت تیسری دکھائی دی۔ اور وہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ وہ کتنی دیر تک تیسریاں پکڑنے میں مصروف رہا۔ آج اس نے سات خوب صورت تیسریاں پکڑیں۔ اور انہیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جمع کر لیا۔ اور انہیں گھر لے گیا۔

اماں نے پوچھا۔ "یہ منہ کیوں لال کر رکھا ہے۔ شاید آج پھر سنبلو کھاتے رہے ہو۔ میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے۔ کہ سنبلو نہ کھایا کرو۔ لیکن تم مانتے ہی نہیں۔ کیوں؟ ان بھاری تیسریوں

نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ؟  
جب رفیع کے ایک دو ملاپ نچے لگے تو وہ زور زور سے  
رونے لگا۔

حکیم کے دن مسخ دین کی لڑکی حسب معمول ایک  
رومال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی۔ رفیع گھر پر موجود  
نہ تھا۔ وہ باغ میں باڑ کے قریب چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے  
پھول توڑ رہا تھا۔ اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خوبانیاں  
دے کر باغ کے قریب سے گزری تو رفیع کو باڑ کے قریب بیٹھے  
دیکھ کر رُک گئی۔ وہ مزے سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بچا رسے کو پتھر ہی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے  
ایکایک نیلا نے باڑ سے ایک ٹہنی توڑ لی۔ رفیع نے سر اٹھا کر  
دیکھا۔ نیلا تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اس نے ہار  
بنانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر باڑ کے قریب کھڑا ہو گیا۔

نیلا بولی۔ ”تمہارا نام رہی ہے ؟“  
”ہاں، رفیع۔“



” رہتی ! “

” رہی کیا نام ہے ؟ “ نیلا نے اپنی چوٹی سی ناک کو  
اڑچا کر کے کہا۔

” رہی نہیں، رفیع ! “

نیلا بولی۔ ” میرا نام نیلا ہے۔ ہم وہاں رہتے ہیں (انگلی سے  
اشارہ کر کے) وہ ان اخروٹ کے درختوں کے نیچے ۔ “  
رفیع کہنے لگا۔ ” ہمارے ہاں چنبلی کے پھول بہت اچھے

ہیں — “

نیلا بولی: ” ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ “  
رفیع کہنے لگا۔ ” ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی —  
خوبانیاں ہیں۔ “

نیلا نے سر ہلا کر کہا۔ ” جھوٹ، ہماری خوبانیاں سب سے  
میشی ہوتی ہیں۔ “

رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ” میں چنگ بڑھا  
کتا ہوں۔ بہت اونچی لے جاسکتا ہوں۔ “

” اچھا ! “ نیلا نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر  
یقین نہ آ رہا ہو۔

”میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں۔“

”ہوں۔؟“

”میں — میں چنبیلی کے دار بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھو !“  
نیلا بولی — ”ہم تم سے اچھے دار بنا سکتے ہیں۔ ادھر دکھاؤ

پھل !“

رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے باڑ کے اس طرف لے  
آیا۔ پھر دونوں بیٹھ کر دار بنانے لگے۔ دار بناتے بناتے نیلا  
بہنسے لگی۔

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا: کیوں نہنتی ہو؟ کیا بات ہے؟  
نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی..... میں کہتی ہوں تم  
دار نہیں بنا سکتے اور کیا؟“

رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک ہلخانچہ لگھا دیا۔  
نیلا کہاں ہنس رہی تھی۔ کہاں اب زور زور سے رونے لگی۔ نیلا  
کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے؟ کیا نہ  
کرے۔ اگر اسی کو پتہ لگ گیا کہ اس نے نیلا کے ہلخانچہ لگھا یا  
ہے تو پٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا۔

”اچھا نیلا جانے دو۔ مت رُو۔ میں کہتا ہوں مت رُو۔“

دیکھو میرے پاس تیسٹریوں کے تین سوپر ہیں۔ وہ اندر ڈبے میں بند رکھے ہیں۔ میں وہ سب تمہیں دے دوں گا۔ لو اب تم نہ روؤ۔ میں تمہیں ابھی لاکر دیتا ہوں۔"

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا۔ اور تیسٹری کے پروں والا ڈبہ لے آیا۔ اور ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پڑ ہیں۔ یہ دیکھو، دیکھو نا۔ نیلا مت روؤ۔ اور یہ سب پھل اور ہار بھی تمہارے ہوتے رفیع نے ایک دو ہار اٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

کس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ انہوں نے جھاڑیوں سے سنبلو جن جن کر کھائے۔ انگور کی بیلیں پر چڑھ کر سونے کی طرح پھکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔

نیلا کے گھر میں آخری دن کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر۔ خامنی کو لڑا۔ اور چپن کے دوسرے محبوب و مرغوب کھیل کھیلے۔ وہ ندی کے کنارے جا کر گڈریوں کے ساتھ ٹاپے..... پنگلیں بچائیں بانسریوں کے گیت سنے۔ کبھی کبھی رفیع دو لہا بنتا تھا۔ اور نیلا ڈھنسنے اور گھائی کے دامن میں ننھے ننھے گڈریئے براتی بنے ہوئے شوز بجاتے ہوئے کاغذ کی ڈالیاں بجاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے۔

ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا۔ اور جب کبھی نیلا بھیل ہی کھیل میں شوخی یا شرارت سے کسی دوسرے گڈ ریئے کی دلہن بن جانے پر آمادگی ظاہر کرتی تو رفیع بگڑ دکھڑا ہوتا اور کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا اور لڑائی پرتل جاتا یا نیلا سے روٹھ جاتا۔ روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے نیلا کو کسی کسی منتیں کرنی پڑتی تھیں اور بہت سخت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اس خوبصورت دادی میں دو ننھے دلوں نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا، سہاؤنا اور پیارا سپنا دیکھا۔ وہ سپنا جو پہاڑی جھرنوں کے گیتوں کی طرح دلغریب تھا۔ وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی۔ پھر کیا ایک رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی۔ اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ رفیع نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دے دی۔ جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ ایک چاقو تھا۔ جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا۔ اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔

اور نیلا..... نیلا نے بھی اپنی سبز منکوں کی مالا بھے

وہ سرفقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی اتار کر رفیع کو دیدی۔ اور یہ سب کچھ چپ چپ کر ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے۔ اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی۔ رفیع کا دل بیتاب ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس نے نہایت ہمت سے کام لیا۔ اس نے اپنے آنسو روک لئے۔ اور مزہ پیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے حب رہے تھے۔

تین سال اور گزر گئے۔ اور پھر ایک بار رفیع کے والد کی تبدیلی اسی حسین داوی میں ہوئی جہاں نیلا رہتی تھی۔ رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اٹھے۔ اور اس عہد کی محسوس خوشیاں اور اس لذتیں زمانے کی تنائیں دل میں کروڑوں لینے لگیں۔ کیا وہ نیلا کو بول گیا تھا۔ کیا کالج کی ہنگامی زندگی نے اس کے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی نہ رہنے دیا تھا؟ کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا۔ ان سب باتوں کا جواب شاید رفیع بھی اچھی طرح

سے نہ دے سکتا تھا۔ ہاں شاید وہ نیلا کو قہر پٹا بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں، وہ سبز منکوں کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی۔ اور کسی قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالچ کے پُر مسرت لمحوں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا۔ لیکن یوں ہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دکھش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا۔ عجب زمانہ تھا۔ نہ لڑائی، نہ فٹ بال، نہ ٹینس، پھر بھی کتنی مسرت تھی، ان کھیلوں میں۔ اور نیلا وہ ننھی سی شوخ گڑیا ستلا کر باتیں کرتی ہوتی۔ ایک عجیب دکھش ادا سے ہنستی ہوتی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے گھر آکر نیلا کو دیکھا۔ تو حیران رہ گیا۔ آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا۔ تو وہ ایک ننھی سی پری تھی۔ جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ پھر تیرہ سال تک اس کے تخیل میں نیلا کی یہ تصویر رہی۔ وہ خود لڑکپن سے شباب میں آگیا۔ اس کے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے باغ میں ہاشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت چتے اور چھوٹے تنوں کے پودے تھے۔ آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے اور نیلا..... وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن بلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی۔ سرو کی طرح بلند قامت، شباب کی رعنائیوں کا مرقع جمیل، اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ جو شاید سوچ کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا۔

رفیع اٹھ کھڑا ہوا۔

نیلا بولی: ”تم نے مجھے پہچانا بھتیجا؟“

رفیع کے منہ سے نکلا: ”نیلا!“

نیلا ہنسنے لگی۔ وہی دلکش ہنسی، بچہ رفیع کو دیکھ کر کھلایا

مارنے اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور پنتے کے شانوں کو چھو کر کہا۔

”یہ تمہارا لڑکا کون ہے؟“ کتنا غولبورت ہے اس کا کیا نام ہے؟“

نیلا بے کانتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا: ”ہاں، اس کا

نام ہے رحیمی، محمد رحیمی۔“



کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا۔ اس کے پاؤں تلے

زمین تھی اور دوسرے پر آسمان، وہ نلکا میں گھوم رہا تھا۔ نہایت تیزی سے  
 گھوم رہا تھا۔ پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں  
 لوٹ آیا۔ وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع، اور نیلا کے ساتھ جھاگ جھاگ  
 کرتی تریاں پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جھکے سنبلو کھا  
 رہے تھے۔ ہندی کے کنارے اونچے تنگ پر بھولا بھول رہے  
 تھے۔ گڈریئے بانسریاں بجا رہے تھے۔ گڈریئے براتی بنے ہوئے  
 تھے۔ اور نیلا اس کی دھن۔

بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے  
 کہا۔ " ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ "۔

رفیع بچے کی طرف مڑکا پھر اس نے آہستہ سے اپنی بیب  
 کے اندر سے کوئی چیز نکالی، یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ  
 سے اس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چھکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت محبت  
 سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اٹھا  
 کر گھاٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے  
 ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔



# گلفروس

جب گل فروش کا بیٹا . میٹرک پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے  
بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا ۔  
" جا بیٹا نوکری ملاش کر ! "

بالکل اسی طرح بیسے قرون وسطیٰ کا ناول نویس اپنے  
قسطے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطہ صحرائی  
میں چھوڑ دیتا ہے ۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی ۔ بیچارے لڑکے کے  
سائیکل چلاتے چلاتے ٹھنڈے زخمی ہو گئے ۔ ہونٹوں پر پٹریاں جم گئیں  
وہ مصوم بچہ سا چہرہ کسلا گیا ۔ مگر نوکری کہیں نہ ملی ۔ گوہر مقصد نہ  
ہاتھ آیا پر نہ آیا ۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہیڈل توڑ کر گل فروش کے

بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔ ”آبا نوکری ملنا کچھ آسان نہیں ہے۔“  
یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں  
غریب کیا کروں ؟

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رُک رُک کر  
بولی۔ ”کرنا..... کیا..... ہے ؟ دکان پر بیٹھ جا..... گل فروش  
کا بیٹا بھی گل فروش ہے..... بھول بیچ اور گزارہ کر..... مولوی  
ٹھیک کہتا تھا۔ اس لونڈے کو انگریزی ٹیکوں پڑھاتے ہو ؟ لمبے  
بال رکھے گا اور عورتوں کی طرح مانگ نکالے گا۔ کل سے یہ زلفیں  
کٹا دیے اور ہار بنا..... سنا تو نے ؟“  
اتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گل فروش راہی عدم ہوا۔



بوڑھے باپ کے مرنے پر گل فروش نے اپنی دکان انارکلی  
کے سرے پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدت پسند بنا دیا تھا۔  
اس نے ہمارے گھروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے اور مشہور  
و معروف فلم ایکٹرسوں پر ان کے نام رکھے، گوہر آبدار، کبیرا ادا۔

محل کاربو۔ سلوچنا بار وغیرہ، اور بھی کتنے ہی دلربا اور دلکش موسے  
 تھے۔ جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کی دکان بہت چمک  
 اٹھی۔ اب اس نے ہاتھ بٹانے کیلئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے۔ ریڈیو  
 بھی لگا دیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا۔ چند نمونے ملاحظہ ہو۔  
 زگل کا سیزن آگیا ہے  
 ہماری نوکان پر تشریف لا کر زنگھی باروں کے آپ ٹوڈیٹ  
 ڈیزائن ملاحظہ فرمائیے۔

گھریٹ گاربو کی نئی پچھر کی تقریب پر گل گاربو کے  
 گھرے پہنئے اور پہنائے۔

پھولوں کے خوشنما آدیزے آپ کے حق کے بہترین  
 محافظ ہیں :

پر دے کا نام انتظام ہے۔

مغفروش کی مساعی جمید کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا، بار

گجرے وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں از سر نو زندہ ہو گیا۔ پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ، دفتر بھی پھول لے لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیارہ سے گندی میزیں اور قلمدان پھولوں سے سج گئے۔ دفتر گلستان بن گئے۔ ہر طرف ایک مہک سی اڑی پھرتی تھی۔ کابج کے طلبہ تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ثانی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چٹنے لگے

عورتوں اور بچوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب تو انتہا ہی ہو گئی۔ اگر ایک خاتون سراپا - زگس - بنی ہوئی جا رہی ہے تو دوسری - موتیا - کی ڈالی، ایک زعفران زار تھی تو دوسری دھان کا کھیت، جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوشنما ہریا دل آنکھوں کو طراوت بخشی تھی۔

ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا لیکن ہندوستان کی انصاف قدیم روایات کو تازہ کرنا والے کا دل ہمیشہ غمگین و محزون ہی رہا۔ نوجوان گل فروش ہمیشہ یہی سوچا کرتا کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا تو اس وقت تک کم از کم بی اسے پاس کر لیتا۔ اور پھر اس کو - نوکری - کہیں بل ہی جاتی۔ اور پھر اس کی مشادی

بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی۔ اور یہ بالکل اغلب تھا۔  
 لیکن ..... اب ..... اب وہ بے سانس بھرتے ہوئے سوچتا  
 اب اس کی زندگی اس پھولوں کی دکان پر ریڈیو سن کر اور گھرے بیچ  
 کر برباد ہو گئی تھی۔ اب وہ محض ایک ویران، شکستہ، کھنڈراتی زندگی  
 کا مالک رہ گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے محکمہ کی طرح، تعلیم یافتہ لڑکی تو اس  
 کے طبقے میں دو ہزار قبیلوں والا اعلیٰ کا تہذیبی کرڈھونڈنے پر بھیج  
 دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں  
 پڑھاتے تھے غالباً ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی پھول  
 بیچنے والے کے چلے باندھ دی جائے۔ وہ سماج کا اچھوت تھا۔ ہر عین  
 ہری جن ..... اب ان اوپنٹے طبقے والے لوگوں نے ایک نیا  
 لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کیلئے اختراع کیا ہے۔ کچھ بھی ہو  
 وہ اپنی زندگی ایک آجڑ اور پھوٹریوی کیساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔  
 جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور  
 نہ ہی اخبار پڑھنے کی عادت جو تمام دن اپنا سر چو لھے میں دیتے  
 رکھتی ہو۔ آؤنٹ ..... وہ کسی عورت سے شادی کرنے کا  
 خواہش مند تھا۔ ایک باورچن سے نہیں؛ لیکن اس کے باوجود  
 وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی

بوڑھی ماں کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ اور گویہ بہت حیرت کی بات ہے پھر بھی یہ کچھ بغیر نہیں رہا جانا کہ اُسے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ اور گو وہ ریشم کی خوبصورت قمیضیں پہنتا تھا۔ جن پر لمبی لمبی خوش رنگ وحاریاں ہوتیں۔ اور عطر چلیل لگاتا تھا۔ پھر بھی اُسے شراب، سگریٹ اور زبڈیوں سے بہت نفرت تھی۔ سینما، ٹیلیوٹر دیکھنے پر بھی اس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ اس کے دوست اکثر اس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے۔ آخر ایک بھول بیچے والا کیونکر شریف رہ سکتا ہے؟

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا۔ یوں تو وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "انسٹرنس" پاس بیٹا۔ آوارہ نہ ہو جائے۔ جو نوجوان بھول بیچتا ہو اور سینما دیکھتا ہو اُس کیلئے شریف رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب تک؟

اسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مُصر تھی۔ مگر نوجوان گل فروش نہیں مانتا تھا۔ اس کے ناخبرہ کار شاعرانہ دل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین صورت بنا رکھی تھی۔ وہ اسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔

بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی نرم مزاج، دیہاتی

بہو کے حق میں تھیں۔ اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبول صورت  
غریب طبیعت لڑکی پر تھی۔ گلفروش اس کے برعکس ایک ساڑھی لٹاؤ  
سینا پسند، قیمتی کی تلاش میں تھا۔۔۔۔۔۔ مگر آہ، یہ وہ تیرہاں  
تھیں جو اس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں۔ کیا وہ سوسائٹی کا  
اچھوت نہ تھا۔۔۔۔۔۔ شخص ایک گلفروش۔



ایک سیخو دار کی دلکش شام کا ذکر ہے۔ اس دن نشاط  
تھیٹر میں دو کھڑے بیو تھو کا لافانی شاہ کار ”لے مسز الزبتھ“ دکھایا  
جانا تھا۔ اور گلفروش دکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی  
تیاریاں کر رہا تھا کہ اسنے میں ایک چھوٹی سی ”مارس“ گلفروش  
کی دکان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس میں ایک جوان لڑکی  
اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں۔ گلفروش دکان کی میز پر  
اتر کر موٹر کے قریب گیا۔ اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے  
کہنے لگا۔ ”میم صاحبہ کیا حکم ہے؟“ اس پر جوان لڑکی نے  
موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں کچھ ہار اور گجرے  
چاہئیں۔“



”آئیے، دکان کے اندر تشریف لائیے۔“

لاڈکی نے بہت سے بار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے، چلتے دقت کہنے لگی، ”کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے بال روم کو سہانا ہو گا۔ کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ۔ کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو، ٹھیک ہے؟“

گل فروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گل فروش نے پھر جھک کر سلام کیا اور انگریزی میں نوجوان لاڈکی سے پوچھا۔

”سرمکار آپ کا پتہ؟“

لاڈکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا۔ ”۱۰، قلیش روڈ، پلیئرز!“

نوجوان گل فروش نے سچتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرضی سلام کیا اور آہستہ سے کہا۔ ”۱۰۔ قلیش روڈ، پلیئرز،“

۱

اس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بوڑھی ماں

کو عکس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اکاس ہے۔ وہ نہ صرف کھانا کم کھانے لگا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے منٹوں ایک طرف ٹھکی بازہ کر دیکھنے لگتا تھا۔ ایک نوالہ منہ میں، دوسرا ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگتا۔ پھر کچھ یاد آ جانے پر ایک آو سر د بھر کر جلد جلد نوالے اٹھانے شروع کر دیتا۔ کبھی دو چپاکی چاننی جیسی حین اور نازک کلیوں کو زری تاروں میں پروتے ہوئے یکا یک سرک جاتا، مسکراتا، پھر فوراً خفگیں ہو جاتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور جب اس کی ماں اس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا؟ تو وہ اس درد بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا اور کہتا: ”کچھ بھی نہیں اماں!“

اللہ اماں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو مہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہوگی؟ — میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟“

خود بے چارے گل فروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اس کیساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہر روز حین عورتیں دیکھتا تھا۔ اس نے تو سینکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے۔ نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے لئے نئے انداز سکھائے تھے کتنی

شوخی لگا ہوں کے وار سے تھے۔ ہزاروں تبسم لبوں سے شہید  
 کی طرح میٹھی بولیاں سنی تھیں۔ کسی کے گداز بازوؤں کے سٹو لپن  
 نے اُسے اتنا متاثر نہ کیا تھا۔ اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما  
 رنگ اس کے معصوم دل پر ہمیشہ سائے کی طرح گزر جاتے تھے۔  
 لیکن اب ایک لمخت یہ کیا ہو گیا تھا..... جب بال روم کو سجاتے  
 وقت وہ بھی اس کے پاس آکر ایک دم کیلئے کھڑی ہو گئی تھی۔ تو  
 اس کی آنکھیں کیوں جھپک گئی تھیں۔ سانس کیوں ایک لمحے کیلئے  
 رک گئی تھی۔ اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے باروں سے مزین  
 کرتے وقت اس کی انگلیاں اس کے ہاتھوں سے چھو گئی تھیں۔ تو  
 اس کی رگوں کا خون کیوں آتش سیال بن گیا تھا۔ اور پھر..... جب  
 اُسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پانیو کی طرف  
 چلی گئی تھی۔ تو وہ کیوں بیتاب ہو گیا تھا۔ اور یہ کس قدر عجیب  
 احساس تھا کہ اسے پانیو بجاتے سن کر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے  
 گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں۔ اور اُنہی  
 میں سے ایک رنگین دھڑکن نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبت تھا۔ وہ احساس جو عمر میں صرف  
 ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے گلہ روش کی آنکھوں میں آنسو

بھرائے تھے۔ اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے  
آنسو پونچھ ڈالے تھے



اس امر کا صحیح اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے کہ لڑکی کے  
دل پر گلفروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا اثرات پیدا  
کئے۔

مگر یہ کہنے میں تو ذرا آمل نہیں کہ اب وہ اکثر اس کی دکان  
پر آیا کرتی تھی۔ یہی پھولوں کے آویزے خریدنے کیلئے، گلہستے  
گجرے پسند کرنے کیلئے۔ لیکن یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی۔  
جسے کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی تھی۔ کالہجوں کی کتنی ہی لڑکیاں  
روزانہ گلفروش کی دکان پر آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب کیسے  
لیا جاسکتا ہے کہ وہ سب گلفروش سے محبت کرتی تھیں پھولوں  
سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اُبڑ مالی  
سے محبت کی پینگیں بڑھالی جائیں۔ ایسی حماقت کون کریگا؟  
..... اور صنعتِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں  
کے مقابلے میں زیادہ دانش مندی کا ثبوت دیتی ہے کون کہتا

ہے کہ کھردش کبھی قتل مندر تھا، مگر اب تو نہ ہے اس کی عقل پر کیا پردہ  
 پڑ گیا تھا، کہ جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوتے دکان میں داخل ہوتی  
 اس کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگتا، وہ سمجھتا کہ وہ  
 غنیف سی مسکراہٹ جو اس کے رنگیں لبوں پر کبھی بھی آجاتی تھی، صرت  
 اسی کیلئے تھی۔ اس کی صندلی کلائیوں میں پڑی ہوئی تقری چوڑیوں کی  
 میٹھی چھنچھناہٹ اسی کے کانوں کے لئے پیدا ہوئی تھی، اور سفید ساڑھی  
 میں چھپے ہوئے کانوں میں گلاب کے پھولوں کے جھللاستے  
 ہوئے سرخ سرخ آویزے شاید اسی کی حریف نگاہوں کیلئے پہنے  
 جاتے تھے شاید ؟.....

وہ کبھی کبھی خیال کر لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے  
 کبھی کسی اندھیری رات میں جب کوئی اسے دیکھ نہ سکے، اس کی کوشش کے  
 گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش  
 ہوتا، اور پھر جب کبھی ایک چمپر یا سا سایہ اس روشنی کے ایک طرف  
 سے ہو کر دوسری طرف کو گزر جاتا تو اس کے دل کی حرکت یک بارگی  
 تیز ہو جاتی، اور کیا ایک بجلی کے بجھے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس  
 کرتا، پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف ٹھٹھکی لگاتے دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ  
 روشنی سمجھ جاتی، اور اس کے دل میں ایک اندھیرا سا چھایا جاتا اور وہ

اس گہرائے ہوئے مسافر کی طرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔  
 اور اماں بیچاری دل میں روز کڑھتیں، طے اللہ میرے بیٹے  
 کو کیا ہو گیا ہے ؟ رات دن کس ٹکڑ میں غلطان رہتا ہے، کہیں کسی کی نظر  
 تو نہیں لگ گئی، کوئی آسیب ؟ ..... پھر یکایک اپنے منہ پر  
 ہاتھ دھکتی اور سر جھکا کر چادر کاٹنے لگتی۔  
 اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ایک ابراؤد شام کو وہی موٹر جو آئی تو گل فروش نے دیکھا۔  
 کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی، گل فروش کے جھک کر سلام کرنے پر بوڑھی  
 عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے اور  
 رات کو بھی کوٹھی کی سچ جا.....“

”بہت اچھا سرکار“ گل فروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر  
 کی خالی سیٹ پر ڈالی۔

بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا، ”کل مئی ہر مزجی کی

شادی ہے، نا، بہت سے پھول چاہئیں۔“

موٹر چل دی غریب گلفروزش سر جکائے رہ گیا۔



دوسرے دن گلفروزش کو ایسا معلوم ہوا کہ اسے جکسا سا بخند ہے اس کا سر گھوم رہا تھا۔ مگر اسے آج تو بہت کام کرنا تھا، وہ بہت سویرے اُٹھا اور دکان پر کام کرنے چلا گیا۔ آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کی محبوبہ کی شادی تھی۔ آج اس نے وہ وہ خوبصورت ہار اور گجرے تیار کئے۔ جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ آج کی محبوبہ کی شادی تھی۔ اس نے پھولوں کو ندیں تاروں میں الجھا کر نازک پادریں بنائیں۔ حسین گلہستے کلیوں کے چندن ہار تیار کئے۔ اور موتیا کے نیم واسپولوں سے ایک خوب صورت نمک تیار کیا۔ آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی۔

گلفروزش نے کوشی کا کوڑو کوڑھیلوں سے سجایا۔ وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر جاگا پھر رہا تھا۔ اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا۔ کتنی کہاں گئی، کتنی رونق تھی۔ ہڈی عورت مسکراتی ہوتی ادھر سے اُدھر نکل جاتی۔ اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی پیسوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہو کر کسی کا ہنڈل گھما کر ادھر ادھر ڈھکیٹا ہوا لے جا رہا تھا۔ ایک کمرے میں

اس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا۔ وہ اپنے قبولِ صدمت بھائی کے پاس بیٹھی — جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے۔ بعد اُسے دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی ایک لمحہ — صرف ایک لمحہ کیلئے گلغزویش نے اسے غلامتِ بار بنگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

کیا لڑکی کے نازک دھمکین ب زنگیں بھی طرح زرد نہیں ہو گئے تھے اور کیا گلغزویش نے واقعی اس کی نگاہ کی خطا واریاں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اس کا موسم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ آج دن بھر سے گلغزویش بھوکا تھا، بھوکا، نہیں۔ اسے بھوک لگی ہی نہ تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھی ج چکی تھی۔ بیڈنچ رہا تھا۔ گلغزویش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے چاروں طرف انھیرا نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ . . . . وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کیلئے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا نمکٹ لپیٹ رکھا تھا۔ لکشمی وہ اپنے



ہاتھوں سے یہ ٹکٹ اُسے پہنا سکتا اور پھر اس کے قدموں میں گر جاتا۔  
 ..... بیوقوف مگھڑوش :-



رات کے نو بجے فلش روڈ سے موٹر میں چلنا شروع ہوئی  
 آگے آگے نوشہ کی کار بھی پھولوں سے سجی ہوئی۔ اس میں دولہا  
 اور دلہن بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے بیس تیس موٹریں مارن بھاتی  
 ہوئی آرہی تھیں۔ فلش روڈ سے ٹرنگٹن روڈ تک تو لوگوں کا بہت ہجوم  
 تھا۔ بندہ قہقہے اور مارنوں کی دلخراش آوازیں۔ موٹروں کے انجنوں کے  
 گواگڑاہٹ اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا.....

خدا خدا کر کے جب ٹرنگٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا  
 شروع کیا۔ اور جب غاپ روڈ آگئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اڑی جا رہی  
 تھی۔ یہاں تک خوشگوار سا اندھا دھن بھلی کے کھجے بھی دور دور تھے  
 اور دور دور گھٹن دار درخت کھڑے تھے۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔  
 اس کے بازو کھلے تھے۔ اور وہ عین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔  
 نوشاہ نے زور سے مارن بھایا۔ اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا۔ اس نے

بریک بھی دبائی۔ مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔ وہ پھل شمع سے  
موٹر کے نیچے آچکا تھا۔ اس کی چاقی اور بائیں بازو سے خون بہر رہا تھا۔  
دھن ایک دلخراش پیچ مار کر بے ہوش ہو گئی۔



نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔  
اسے اٹھا کر اسی دم ہسپتال میں لے گئے۔ زخمی کو فی الفور آپریشن روم  
میں لے جایا گیا۔ باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے  
آہ بیچارے کو بہت چوٹ آئی ہے۔ وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا  
وہ کون ہے؟ کیا وہ بیچ جائے گا۔ آخر ایک بے عرصے کے بعد  
ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاہ سے کہنے لگا۔ "آخری لمحوں پر ہے تمہاری  
مسنز کو جلاتا ہے۔"

گلفروزش میز پر لٹا ہوا تھا۔ چاقی پرچی بندھی تھی۔ جو  
خون سے سرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر  
ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے لڑکی کی جانب اپنا  
دامن اٹھ بڑھایا۔ آہ! اس لمحہ کی لذتی ہوئی انگلیوں نے کسی  
موتیا کے ٹکٹ کو قحط رکھا تھا۔ کٹ خون آلود تھا۔ پھول دلے

نے اپنے بھولوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی تھی۔ کس لئے؟ کب  
 اس ملاقات کے لئے؟ — بیوقوف گل فروش !  
 لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کیلئے گل فروش کی طرف دیکھا۔  
 گل فروش کا سر اس کی چھاتی پر جھک گیا اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا  
 کر مکٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جیسے کوئی کسی مسموم قسیم بچے  
 کو اپنی گود میں لے لے۔ گل فروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا۔ اس  
 نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں  
 بند کر لیں۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پتے پتے ہونٹوں پر ایک  
 ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ یہ چراغ سحری کی جھللاتی ہوئی لوح تھی۔  
 گل فروش کا اکھڑا ہوا سانس مدبم ہو گیا۔ ڈاکٹر بنجن پر  
 ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ گل فروش کے لب کا نہی، ہلکی ہلکی ایک دو  
 ہچکیاں آئیں

چراغ بج گیا !

لڑکی رونے لگی۔

• یہ کون تھا ؟ • ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا۔ . . . . نوشاہ روتی  
 ہوئی دلہن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

ٹاکٹر نے اپنے ٹانگوں کو ایک خیف سی حرکت دی۔ اور  
نرس سے بولا۔ " دوسرا مریض لاؤ۔ "

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے۔ جب  
ایک مریض مر جاتا ہے تو دوسرا مریض اس کی جگہ فوراً آ جاتا ہے۔



اُس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا چھوٹا بھائی اپنی  
دکان پر دائر کلی کے سر کے قریب، تو تلی زبان میں گجرے لہو چل  
بیچ رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے  
اسے نہایت دل آویز لہجے میں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اسے نئے  
گل فروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو نئے آویزے  
خرید دے۔



# دو فرلانگ لمبی سڑک

پکھریں سے لے کر لاکھائیں تک بس یہی کوئی دو فلائنگ  
 لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز جیسے اسی سڑک پر گزرتا ہوتا ہے۔ کبھی  
 پیدل، کبھی سائیکل پر سڑک کے دو روے پر سوار ہوتا ہے۔ سوٹ سوٹ  
 اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ جن سے نہ چھاؤں، سخت  
 کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف میڈی  
 اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں۔ نہ اس  
 میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے۔ نہ ٹھکان، سخت سخت پتھروں کو  
 کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر کولار  
 بھی بچھی ہے۔ جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان  
 کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، تہاڑے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بھری بھی ہوئی تھی۔ سڑکیں جن کے گرد سرو، شمشاد کے ٹھٹھٹ کھڑے تھے، سڑکیں ————— مگر نام لگانے سے کیا فائدہ۔ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔

متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، ہر صبح اپنے گھر سے جو پکھریوں کے قریب ہی ہے اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاد کالج کے پاس ہی ہے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور شام پکھریوں سے لیکر لاد کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کارنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ہئیت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان گھوڑے، گاڑیاں موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور مجھے کوئی نشان باقی

نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سائولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ  
ہے جیسی پہلے روز تھی۔ جب ایک پریشین ٹھیکیدار نے اسے  
بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے  
ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا واقعات، حادثے دیکھے۔  
ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے  
نہیں دیکھا۔ مڑتے ہی۔ اس کی پتھر ملی چھاتی میں کبھی ایک درز  
بھی پیدا نہیں ہوئی۔

”اے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ رے  
بابا۔ اے بابو، خدا کیلئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے  
کوئی جگوان کا پیارا نہیں، صاحب ہی میرے نئے نئے پچے بلک  
رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان تسمیوں پر۔“  
بمیسوں گد اگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔

کوئی اندھا ہے تو کوئی لنگا، کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے  
تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے  
حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔  
کوئی پیسہ دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی



گالیاں دے رہا ہے، حرامزادے، مستندے کام نہیں کرتے بجیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بجیک

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا ہیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی جھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پیروں تلے آگیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کچھ افسردگی بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ثیاؤں ثیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

بوڑھا آدمی اب گدلیوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا فقرتی حاشیہ بوڑھے کی حرلیں آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے۔ گورہ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، اوٹا ٹانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا، کردوں چالان ؟ ہجور، ہجور کا بچہ؛ پل تھانے، ہجور؟ یہ حقوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

ٹانگے والا ٹانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک گورہ آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی پھڑی رضاعوں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

”کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ۔“

”آٹھ آنے صاب۔“

”دل، چھ آنے۔“

”شہیں صاب۔“

”کیا بچھا ہے، ٹم۔۔۔۔۔“

ٹانگے والے کو مارتے مارتے بید کی پھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر ٹانگے والے کا چمڑے کا ہنر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرام زادے، صاحب

بہادر سے معافی مانگو، مانگے والا اپنی میلی پکڑی کے گوشے سے آنسو  
پونچھ رہا ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب شرک پھر سنان ہے۔  
شام کے دھندلے مین بجلی کے تھپتھپے روشن ہو گئے۔ میں  
نے دیکھا کہ کچھ یوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس  
پہنے باقیں کر رہے ہیں۔  
”بیتا بھرتی ہو گیا؟“

”ہاں۔“

”تنخواہ تو اچھی ملتی ہوگی؟“

”ہاں۔“

”بڑھتو کے لئے کھالائے گا۔ پہلے بیوی تو ایک ہی  
پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔“

”سنا ہے جنگ شروع ہونے والی ہے۔“

”کب شروع ہوگی؟“

”کب اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے  
جائیں گے۔“

”کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر؟“

”نخا کیسا ہے؟“

”ہمارے نہیں ملتا، کیا کریں، ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں۔“

”ادھر حکیم سے دوا . . . . .“

”بھرتی ہو جاؤ۔“

”سوچ رہے ہیں۔“

رام۔ رام

رام۔ رام۔

پیشی ہوئی دھوتیاں، بنگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم، یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت، یہ کسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوا، جنگ۔

قلموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، آپلوں کے ٹوکڑے

اٹھائے نچروں کی طرح دانستی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

”بیٹی ذرا ٹھہر تو۔“ بوڑھی عورت کے چہرے پر ہنسا

تجرباں ہیں۔ اس کی چال مدہم ہے۔ اس کے لیے میں بیکسی ہے

”بیٹی، میں، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی . . . . . میرے اشد؟“

” اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باولی ہوئی ہے“  
 ” اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔“

بڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا  
 رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس  
 کے پاؤں ٹوگمکار رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے۔ اُپلوں  
 کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکانیں کرتا۔ کوئی اُسے  
 ایک لمحہ سستانے نہیں دیتا۔ وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اس  
 کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ٹوگمکار رہے ہیں۔ اُس کی  
 جھریوں میں غصہ ہے۔ اور صُوک اور نکر اور غلامی اور صدیوں  
 کی غلامی !

تین چار نوخیز لڑکیاں، بیڑکلی ساڑھیاں پہنے، باہوں  
 میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں  
 بہن، آج سشلہ پہاڑی کی سیر کریں۔  
 بہن، آج لارنس گارڈن چلیں۔  
 بہن، آج انارکلی،  
 ریگیل ؟

## شٹ اپ یو ذیل

آج شرک پر سرخ ملوان بچا ہے، آریار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ بابا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ سب سے بڑے آدمی کی آمد ہے۔ جی تو سکولوں کے چوڑے چوڑے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے شرک پر دو دو یہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوٹی چوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر میڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی مدت سے تھما آئے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔

جب وہ پیلے پیلے بیاں شرک پر کھڑے ہوئے تھے۔ تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چپ ہیں۔ چوڑے لڑکے ایک دھڑکتی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ استاد اب انہیں کان سے پکڑ کر اشارے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی۔ استاد اُسے تھوڑا کھینچ رہا ہے۔ اور شفیع پگڑی شیک کر، پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور

اذا رہند جتیرں مک لک رہا ہے ۔ دتیں کتنی بد سمجھا رہے پارے  
لال ۔ !

” ماسٹری پانی ؟ “

” پانی کہاں سے لاؤں ، یہ میں تم نے اپنا گھر سمجھا رکھا ہے ۔  
دو تین منٹ اور انتظار کرو ، بس ابھی چٹھی ہوا چاہتی ہے ۔ “  
” دو تین منٹ ، تین منٹ ، آدھ گھنٹہ ۔ “

” ماسٹری ، پانی ،

ماسٹری ، پانی ،

ماسٹری بڑی پیاس لگی ہے ۔ “

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ۔ وہ  
راہر آدھر دوڑتے پھر رہے ہیں ۔ لوگو ہوشیار ہو جاؤ ۔ دیکھو جھنڈیا  
اس طرح بلانا ۔ ابے تیری جھنڈی کہاں ہے ؟ قطار سے باہر  
ہو جا ، پیمائش کہیں کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساری آرہی ہے ۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ ۔ بینڈ کا شور ، پتلی اور چھوٹی

جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی ۔ سوکھے ہوئے گلوں سے  
پڑمردہ نعرے ۔

بڑا آدمی شرک سے گزر گیا ، لوگوں کی جان میں جان

آگئی ہے۔ اب وہ اچل اچل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوابچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوہ پوری، نان کباب۔

ایک خوابچے والا ایک طرے والے بابوے جھکڑ رہا ہے مگر اپنے میرا خواہجہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بنگلی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے اس کے منہ اندر تک پرکھڑا بندھا ہے جیسے بلیوں کے منہ پر جب وہ کو لھو چلاتے ہیں۔

میں سپاٹی کا پانی والا چھڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے چھڑے کے آگے بچتے ہوئے دو بلیوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھڑے والا سردی سے ششترتا ہوا کوئی



گیت گمانے کی گوشش کر رہا ہے۔ بلیوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں  
کہ ابھی شرک کا کتا حصہ باقی ہے۔

شرک کے کنارے ایک بوڑھا لگا کر مارا پڑا ہے اس  
کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی  
کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کیلئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ شرک خاموش اور سنان  
ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ بگڑش سے مس نہیں  
ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم جسے اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر  
اسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند  
دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر  
آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی اور اس کا  
کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا  
ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر خشکا شرک پر ٹپ چنے  
لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں میں پاگل ہوں۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے  
 مجھے پاگل بنانے کی غلامی بخش دو۔ میں مان سڑکوں کی آزادی نہیں  
 چاہتا۔

سڑک خاموش ہے اور سنان، بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے  
 اونگھ رہے ہیں۔  
 یہ دو فرلانگ لمبی سڑک !



بند والی

وہ دھان کوٹنے والی تھی۔ اور بند کے آس پاس رہتی تھی۔ میں اسی ہنوس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس واقعہ کو کم و بیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اور بڑے بھائی جان اور بھابی جان پہلی دفعہ سر پنگر آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بھابی جان کے خون کا دباؤ خطرناک طور پر زیادہ بتایا تھا۔ اور گرمیوں میں کشمیر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں یہاں آئے تقویٰ با ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مگر اب تک میں اس کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا۔ ہر روز اسے چھت پر سے دیکھتا تھا۔ اور ہر دفعہ دھان کوٹنے میں مصروف پاتا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود ہماری آنکھیں چار ہو جایا کرتی تھیں۔ کشمیری حسن یوں بھی تو بہت مشہور ہے مگر اس

لڑکی میں ایسی عجیب دل کشی، ہانکپن اور دل آویزی تھی کہ کچھ بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یوں تو اس کے ہاتھ اور ٹخنے عموماً میلے ہوتے تھے اور بس بھی بوسیدہ اور جا بجا سے تار تار۔ لیکن اس کے بے دماغ حسن کے فراوانی نے انکس کی کم مائیگی اور بے چارگی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے حسن میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ میرا دل بے انتہا اس کی طرف کھپا چلا جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں ہی اُسے ہر وقت دیکھتا تھا۔ وہ بھی کسی وقت جب میں کوئی ناول پڑھنے میں مشغول ہوتا یا غروبِ آفتاب کے وقت دریا میں تیرتے ہوئے شکاروں کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری طرف دُوریدہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی۔ اور پھر جب یکایک ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ملتیں۔ تو وہ کسی قدر شرماتی۔ اٹھا ہوا مسل آہستہ سے اٹھلی میں گر جاتا۔ اور لابی لابی چمکیں شرمگین رخساروں کو چھو جاتیں۔ ہر روز اسی طرح نظارہ بازی ہوتی تھیں۔ میں خوش تھا اور دل میں سمجھتا تھا کہ اس راز سے اور کوئی آگاہ نہیں۔ اس لئے ایک روز مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میرے نوکر چمن نے مجھے آکر سنا یا کہ بجائی جان پوچھتی تھیں کہ یہ سامنے بند والی لڑکی ہر وقت اور کیوں دیکھتی رہتی ہے۔ اور یہ کہہ کر کم نعت مسکراتے لگا۔ معلوم نہیں سچ کہتا تھا یا جھوٹ۔ مگر مجھے بجائی

جان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ایک شام کا ذکر ہے میں سیر سے واپس آ رہا تھا کہ بند کے اس طرف جہاں خیالوں اور شاہ بلوط کے بڑے بڑے گھنے اور قد آور درخت کھڑے ہیں وہ مجھے یکایک مل گئی۔ اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ خوب بنی مٹنی تھی۔ ایک تنگ نیلے رنگ کا پر ہنصے پہنے تھی۔ جو اس کے تناسب احسان کو اچھی طرح نمایاں کر رہا تھا۔ ٹخنے تو نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن ہاتھ آج غیر معمولی طور پر صاف تھے اور بے داغ۔ دودھ جیسی سپید گردن میں لڑیلوں میں پروٹے ہوئے سرخ مکے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ سرخ و سپید زخار چمک رہے تھے۔ اور ان آنکھوں کی نیلی گہرائیوں کو کیا کہوں جنہیں دیکھ کر ڈل میں کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آ جاتے ہیں۔

میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کرا

کر پوچھا۔ کدھر جا رہی ہو ؟

اس نے شرما کر ہاتھ چھڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی اس کے پتے پتے لب کا پسے جس طرح بول کی پتیاں ہوا میں کھاتی ہیں۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اچھار کے درختوں کی طرف لے چلا۔ وہ نا۔ نا۔ نا کرتے

بارہی تھی اور مجھ سے ملتی جا رہی تھی ۔

ایک بڑے چنار کے نیچے ہم جا کر بیٹھ گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے اسے بند والی دکھائی دے رہی ہے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ بینک میں جھوٹ بول رہا تھا۔ صحن میں تو اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ یوں بھی تو محبت میں صداقت خدا نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔

اس نے سمجھ کر اڑنگاہوں سے میری طرف دیکھا اور باریک سی آواز میں کچھ کہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کشمیری زبان میں بول رہی تھی۔ بہر حال اس کا لب و لہجہ نہایت دلکش تھا۔

• دادہر دیکھو • میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا مجھے تم سے محبت ہے • میں رک رک کر اسے عاشقوں کی زبان میں سمجھا رہا تھا • • • • • میرا • • • • • نام • • • • • میں نے ہاتھ کے اشاروں سے بتلاتے ہوئے کہا۔ میرا نام فیروز ہے سمجھتی ہو نا؟ میرا نام فیروز ہے اور • • • • • تمہارا • • • • • نام • • • • • کیا ہے ؟

معلوم نہیں اس نے کیا سمجھا۔ وہ جلد جلد اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ وہ نہایت روانی سے اور غالباً نہایت فصاحت سے

بول رہی تھی۔

الفت، جمی، شہرہ یہی تین نغمہ سیری سمجھ میں آئے۔ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔  
میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے جھٹ منہ پھیر لیا اور ————— اور بھی تند سے رونے لگی۔ وہ ایک محسوس نپے کی طرح رونے پر گویا تلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی اسے بچوں کی طرح گدانا شروع کیا۔ اور اتنا گدایا کہ وہ روتی ہوئی مسکرا پڑی۔ اور پھر کھٹکھٹا کر ہنسنے لگی۔

اب کہو: میں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا پھر روؤ گی؟ جیسے وہ میری بات سمجھ گئی۔ اس نے انکار میں سر ہلادیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کہیں تارے جھلک رہے تھے۔ اور چنار کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان بہارا مرز نو بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے لگن کی طرح اکبر کر رہا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے اور ان کے دوش پر شکار سے چلاتے ہوئے لاجپوں کی پرگھٹ صدائیں لڑو خیز تھیں۔



میں نے کشمیری دوشیزہ کی طرف حویسانہ نگاہوں سے دیکھا  
اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دیں کہ اسے اپنی آغوش میں لے لو  
اس نے آہستہ مگر مستحکم ارادے سے اپنے آپ کو میری گرفت سے  
چھڑا لیا۔ اور سرزنش کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے لگی۔

صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ گناہ.... گناہ....  
میری جان! میں نے اس کا ماتہ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے  
کہا۔ اگر یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ گناہ جنت ہے۔  
اس نے تڑپ کر ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا  
اور میری طرف شعلہ بارنگا ہوں سے دیکھ کر کچھ کہنے لگی۔ غالباً ملامت  
کر رہی تھی۔ میں سر جھکائے سن رہا تھا۔ بکیں و مجبور ہو کر سر جھکانے  
سن رہا تھا۔

شاید اسے مجھ پر کچھ حسم آگیا۔ اس نے میری طرف  
عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔  
اور میرے کان میں کچھ پیار سے پیار سے الفاظ کہہ کر بھاگ گئی۔  
چار اور بلوط کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی یہ جا وہ جا، ایک  
دم غائب ہو گئی۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا۔

اپنی چھڑی اٹھائی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔  
یار تم نرے گدھے ہو۔ گدھے اور احمق اور آلو !



دوسرے دن دوپہر کو میں چھت پر چڑھا۔ اور چاروں طرف  
نظر دوڑائی۔ لیکن جانِ آرزو کہیں نظر نہ آئی۔ اُدھلی منہ کھولے پڑی  
تھی۔ اور ساتھ ہی موصل بھی میڑھا پڑا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ نہ  
دھان کی بوہری کہیں نظر آتی تھی۔ نہ دھان کوٹنے والی۔ میں حیران  
تھا اور دکھا کس کا ایک ناول گھٹنوں پر رکھے یوں ہی سوچ رہا تھا۔  
آج دھوپ کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ آج کدھر چلی گئی ہے۔ کہیں  
بیلہ پڑ گئی ہو۔ دریا کا پانی آج کس طرح نیلم کی طرح چمک رہا ہے  
وہ نیلا پیر بن اسے کتنا بھلا معلوم دیتا تھا۔ اور وہ گلے میں سرخ منکے  
مگر بے بہت شوخ و شنگ۔ میں اسے جتنی بھولی بھٹاتا تھا۔ وہ اتنی  
ہی طرار نکلی۔

رحمن میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے ابرو  
استقبالیہ انداز میں اوپر اٹھائے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ آج فریزی  
کو خوب مار پڑی۔ فریزی ؟ فریزی ؟ کون۔ فریزی ؟  
رحمن نے ہند کی طرف اشارہ کیا۔ وہی دھان کوٹنے

والی فریزی .... فریزی۔ میں نے آہستہ سے دل میں دہراتے ہوئے کہا۔ خوبصورت نام ہے فریزی .... فیروز .... فریزی۔ واکس سے تو بد رہا اچھا ہے۔ اونہہ انوکھا کس بھی جلا کوئی نام ہے؟ اہل رملن آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے، اس کے بھائی نے۔ اور اس کے ہونے والے شوہر نے اسے خوب ہی پٹایا۔ کل شام کو پتہ نہیں وہ کہہ چکی تھی۔ اور بیت دیر کے بعد واپس آئی تھی۔ ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے اس کے منگیتر نے اس کے لئے ایک نیلا ریشمی چٹہ خریدا تھا کہ وہ اسے نکاح کے روز پہنے۔ کم قیمت وہی نیلا چٹہ پہن کر کہیں چلی گئی۔ گویا کہیں اپنا بیاہ رہا ہے جا رہی تھی۔ ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ مگر آج چٹی بھی خوب ہے عمر بھر یاد رکھے گی۔

کیا بچو اس کو کہے ہو؟ میں نے گرج کر کہا: ”دور ہو جاؤ بیباں سے۔ میں نے تم سے کب کہا ہے کہ فریزی اور اس کے منگیتر کے قصے یوں مجھے اگر سناؤ؟“ یہ کہہ کر میں نے کتاب کو زور سے کھولا اور اُسے نہایت توجہ سے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ گو میں نے نگاہ اوپر نہ اٹھائی۔ لیکن بھڑکی جان گیا تھا کہ شیطان میری طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف مزید

توجہ دینی مناسب نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس کے واپس چلے جانے کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سامنے فریزی کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں دھانوں سے بھرا ہوا تھیلا پکڑے تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہاں وہ رو رہی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر اور بھی نودر نودر سے رونے لگی۔

میں نے پریشان ہو کر اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بنام کرے گی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں کم نبت روئے جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کتنی آجڑ ہے اور گنوار۔ کس طرح میری طرف ٹھٹھکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے۔ مجھے نیچے ہی چلنا چاہیے۔ میں اپنے دل میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا۔ اور اس بیوقوف لڑکی کو کوس رہا تھا۔

میں نے کتاب اٹھائی۔ کرسی کو تھکایا اور اسے بازو میں ٹھکاتے ہوئے فریزی کی طرف نگاہ کئے بغیر نیچے اتر گیا۔ غلی منزل میں زینے کے قریب بجائی جان کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں۔  
”نیچے اتر آئے ہو دھوپ تیز ہو گئی ہے“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”اور سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس کرتا ہوں۔“ تمام دن بستر پر لیٹا رہا اور پھر جتنے دن سرینگر میں رہا۔

کبھی چٹ پر نہیں گیا۔ سات آٹھ روز اسی طرح رہنے کے بعد  
میں نے بھائی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ میرا تو اب یہاں دل  
نہیں لگتا۔

”واپس شجاع آباد چلے جاؤ۔“

”بہت اچھا۔“ میں نے کہا اور دوسرے ہی دن سرہنگ  
سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

✠ ✠ ✠

اتنا کہہ کر فیروز خاموش ہو گیا اور ہوس بوٹ کے ڈھلنگ  
روم کے درتپے سے باہر دیکھنے لگا۔

بس ! میں نے آہستہ سے پوچھا۔ مجھے غیر محسوس طریقہ  
پر یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان کا دلچسپ حصہ ابھی باقی ہے۔ اس  
لئے کچھ توقف کے بعد میں نے پھر استفسار کیا۔ بس ؟

فیروز نے آہستہ سے ایک سگسٹر سلگایا۔ ایک دو کھش  
لگائے۔ اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے رک رک  
کر کہنے لگا۔

”نہیں..... تو..... اچھا..... بقیہ بھی سن لو۔“

✠ ✠ ✠

گھر بچ کر بھی میرا دل نہ لگا۔ ہر وقت پریشانی سی رہتی تھی۔ اور دل میں ہر آن تجھ عجیب سی ہے جینی اور بے کلی پاتا تھا۔ کچھ عجیب ہی حالت تھی کہ جس کا ہر بار تجزیہ کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کبھی سوچتا میں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ کبھی سوچتا، میں نے جو کچھ کیا موقع و محل کے مطابق وہ ٹھیک تھا اور اگر ایسا نہ کرتا تو شاید۔ اس گنوارن کے لئے اپنی آبرومندی میں ملا لیتا۔ اور پھر کیا ایک اس گنوارن کا بھولا بھالا روتا ہوا چہرہ سامنے آ جاتا۔ دل میں ایک کسک سی ہوتی۔ اور میرے ہے اختیار اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ میں نے آخر کیا ہی کیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے میں نے سرگز کوئی گناہ نہیں کیا۔ کم از کم اس معاملے میں تو میرا ضمیر صاف ہے۔ مگر پھر وہی روتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اور ان نیلی آنکھوں سے بہتے ہوئے طوفان کے آگے میری سب طفل تسلیاں ریت کی دیوار کی طرح نہ جاتیں۔

ایسی طرح ڈیڑھ مہینہ اور گزر گیا۔ خزاں آئی اور خزاں کے آتے ہی بھائی صاحب اور بھابی جان بھی سرینگر سے آگئے میں اسٹیشن پر اٹھیں لینے گیا تھا۔ بھابی جان اب بالکل اچھی ہو

گئی تھیں اور ان کے بشاش اور پر رنق چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے  
 کیلئے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ دوسرے لمحے ہی میں دبائے کیوں  
 میں اداس ہو گیا۔ آدمی کی نفسیاتی زندگی میں پرواز خیال بھی عجیب چیز  
 ہے۔ بھائی جان کو دیکھتے ہی فریزی یاد آگئی کتنی عجیب بات  
 تھی۔ مگر میں سوچ کہتا ہوں کہ پیٹ فارم پر کھڑے کھڑے میں صاف  
 اور واضح طور پر فریزی کے طول چہرے اور اندو گھیں آنکھوں کو دیکھ  
 رہا تھا۔ یا شاید یہ سب واقعہ ہی تھا۔ بھائی صاحب نے میرا چہرہ  
 یکایک اُترا ہوا دیکھ کر کہا۔ کس سوچ میں پڑے ہو؟  
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اور ہم موٹر میں بیٹھ  
 کر گھر آ گئے۔

شام کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی باتیں  
 اور سرینگر کی باتیں۔ سن مرگ اور پہلکام کے مناظر، کسٹم والوں کی  
 بے ضابطگیاں۔ زعفران کے کھیت اور ٹڈیور کی بد مستیاں۔ اسی  
 طرح باتیں کرتے ہوئے بھائی صاحب آنکھیں جھپکنے لگے۔ سفر  
 سے تھکے ہوئے تھے۔ میں بھی اُٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔  
 خواب گاہ کے اندر رحمان بستر بھاڑ رہا تھا۔ مجھے اندر  
 آتے دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے رکا۔ پھر بستر بھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے آپ سے محبت ہو گئی تھی ۔  
 اس کی نگاہیں ہمیشہ ہنس بوٹ کی چھت پر کسی کو ڈھونڈا کرتیں ۔ اور  
 پھر وہ اسی طرح بکھٹے بکھٹے سے اختیار ہو کر رونے لگتی ۔ ”  
 میرے دل پر ایک تیر سا لگا ۔ آہ ! وہ مجھ سے محبت کرتی تھی  
 ..... ایک دہشیزہ کی پہلی والہانہ محبت ۔

اس کے ماں باپ نے اُسے بہت بھایا ۔ بھایا اور آخر  
 تنگ آ کر اس کی شادی کر دی ۔  
 ” ارے ۔ ” میں نے چونک کر کہا ۔

” شادی سے ایک روز پہلے وہ میرے پاس آئی ۔ ” مہمن  
 نے سلسلہ کلام کو باری رکھتے ہوئے کہا ۔ وہی نیلا ریشمی چھ  
 پہنے ہوئے تھی ۔ وہ نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا  
 تھا کہ وہ رو کر اس کی آنکھوں کے چشے سوکھ گئے ہیں ۔ اور چلا  
 چلا کر اس کے گلے میں آواز کی قوت باقی نہیں رہی ۔ ” وہ کدھر  
 گئے ہیں ؟ ” اس نے کھوکھلی سی آواز میں مجھ سے پوچھا ۔

” وہ گھر واپس چلے گئے ہیں ۔ ” میں نے جواب دیا ۔  
 اس پر وہ جیخی نہ چلائی ۔ گردن جھکا کے چپ چاپ دیر تک  
 کھڑی رہی ۔ پھر آہستہ سے بولی ۔ ” وہ کب آئیں گے ؟ ”



مجھے اس پر جسم آ رہا تھا۔ ریشمی چند پہنے ہوئے بھی وہ کس قدر غریب معلوم ہو رہی تھی۔ غریب اور بے کس، گنتی بے چارگی اس کے ہلبے میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اس چھٹی سی عمر میں مصائب و آلام کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ گردن جکائے کھڑی تھی۔ اور میرے جواب کی منتظر تھی۔ اس کے پھول سے رخسار جو کبھی سیب کی طرح سرخ تھے۔ آج برت کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ بس موم کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ کاش میں اسے تسلی دے سکتا۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا کہ میں اُس کی آس بندھا سکتا۔ اور اس کے زرد زرد چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑا سکتا۔ یہ کہہ کر رحمن کچھ دیر چپ ہو رہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”دوسرے روز اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے تیسرے روز وہ اپنے کمرے میں مڑہ پائی گئی۔ اس نے زہر کھالیا تھا۔“  
 فیروز خاموش ہو گیا۔ ہمارا شکا ماڈل میں داخل ہو چکا تھا۔ باغیوں کے چوہوں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ وہ نہایت نرم اور پُرسوزے میں چوہوں کی آواز کی ال پرگما رہے تھے۔  
 ”میرے پیارے آتیرے انج میں بہا آئی ہوئی ہے؟“

میرے پریم آ۔ اگر تیرے درخت پھلوں سے لمبے پڑے ہیں  
میرے پیارے آ کہ پھلوں کی بہار کا زمانہ میں نے کا، شش انتظار  
میں گزار دیا۔

میرے پریم جلد آ، کہیں اس بہار کو خزاں کا دیو نہ چٹ  
کر جائے۔

”اور میں میری کہانی بھی یہاں ختم ہوتی ہے۔“ فیروز نے  
آہستہ سے کہا۔ اس کے لبوں پر ایک یاس اٹھیںز مسکراہٹ کھیل  
رہی تھی۔ کشتی کے پہلو پر جھک گیا۔ اور ہاتھ سے اشارہ کرتے  
ہوئے بولا۔ ”وہ وہ دیکھتے ہو نا۔ وہ جو ڈل کے اس طرف چلا  
کے درخت میں۔ وہاں اس کنج میں سرسبز گاس کے نیچے میری  
فرنی لمبو خواب ہے۔ غروب آفتاب کے بعد وہاں چلو گے  
ارشاد بجائی۔“

دور بہت دور ایک دہنجی اپنی کشتی کو کنارے پر لگا رہا  
تھا۔ گانے کی آواز نے شاید اسے بھی متاثر کر دیا تھا۔ فضا کی  
خاموشیوں کو چیرتی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی۔ اس  
کی سرلی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔  
”آہ میرے پریم! تیرے باغ میں بہار آئی اور چل

بھی گئی ۔

آہ ۔ میرے پیارے ! تیرے درختوں پر پھول کھلے اور مرہبا  
بھی گئے ۔

آہ ۔ میرے پریم ! درختوں کے پتے تیرے انتظار میں تڑپ  
ہو گئے ۔ اور ان پر ہر ایک سفید دیو کی طرح چھا رہی ہے ۔

آہ ۔ میرے پیارے ! تو نے اپنے خزانے کو یوں لٹا  
ہوا چھوڑ کر پدیں کیوں جا بسا ؟

میں نے اس کا ہاتھ ندر سے دبا دیا ۔ میری آنکھوں میں  
آنسو اُٹھ آئے ۔ ہم دونوں پر وہ اشاکر باہر دیکھنے لگے ۔

ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لڑاں  
تھیں ۔ سوا میں پھولوں کی بو بسی ہوئی تھی ۔ ہمارے ارد گرد کنول  
کے پھول تیرے رہے تھے ۔ اور ان کی نازک نازک تہیں پر پانی  
کے قطرے ٹپکے ہوئے تھے ۔ کسی کی ہلکیوں پر آنسوؤں کی طرح  
اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے ۔ کسی کے گلے  
میں سرخ منکوں کی طرح ۔

ویکسی نیٹر

جب میں ایف۔ اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں ویکسی فٹر بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ریشماں تھی۔ ریشماں کے جن و جمال کا چرچا تو میں اُس سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا۔ اور خاص کر راستے میں ایک پولیس سارجنٹ نے جب اُسے معلوم ہوا کہ میں پنڈور کے گاؤں میں ویکسی فٹر بن کر جا رہا ہوں مجھے بتایا کہ ”پنڈور کی دیکش وادی میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں بکشن جی کاکنڈ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔“  
 ہائیکر دار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں مہونے کی طرح چمکتے ہیں اور جو آج کل ویران پڑا ہے۔ اور صرف اُسے

وقت استعمال کیا جاتا ہے جب جاگیر دار صاحب یا ان کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے اناروں کا جنگل، جو پنڈور کے مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگلی بنگ سیب آلوچے بھی اور ملوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلے کسی محبوب کی باہرں کی طرح ان پھلدار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں۔ اور جن کی آغوش میں سے بنفشے کے پھول ہر لمحہ سکراتے اور شرماتے ہیں۔

ہاں پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں لیکن وہاں اگر تم نے ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔

”سچ سچ۔“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”خدا کی قسم۔“ پولیس سارجنٹ نے

ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا۔ لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا۔ آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی؟ ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہیے۔ اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ چاہے وہ مٹی

ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرنے کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان ہی سمجھتا ہے۔ لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا کسی میٹرن کریمیاں کیا تھا تو میری شکل و شبہات بہت سے لوگوں کیلئے قابل رشک تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان فلوں گاؤں بھریں میں ہی اپنے ٹھٹھک کا ایک سبیلہ جوان تھا۔ اور پھر انٹرنس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا، گیارہ روپے تنخواہ تھی۔ کلاہ پر ٹرے دارنگی، پاؤں میں کام دار جوتی اور چہرے پر بوخیں سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا میرے بچپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ، دوست وہ بھی کیا دن تھے۔ کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا۔ دیوان غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، وہ ہے، وہ ہے۔ . . . . آہ اس وقت کم نعت یاد نہیں آ رہا دماغ چکرا رہا ہے لیکن — اچھا۔

ہاں، تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں۔

ریشماں کی آنکھیں، ان نیلی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں

ان دو پاک دسات مجلسوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں، جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں، ریشماں کے نازک لب و شرمسار عجب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی نشان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کی پوریں، جگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوخیز بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جھنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی نمبری کی طرح میٹھی اور اُلتے ہوئے ٹنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لودھار، اس کا قد، فارسی کا ایک شعر ہے۔ ایک نہایت ہی سوزوں شعر ہے لیکن..... کم نیت یاد نہیں آ رہا، بالکل زبان پر پھر رہا ہے۔ آہ کیا خوب شعر تھا، نظیری کا شعر، نہیں عرّی کا، آہ اب حافظ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا۔۔۔ کچھ یاد نہیں رہتا۔ مجھے لب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا۔

تو یہ تھی ریشماں، پنڈو کی وادی کی حسینہ، بیشک ایک نایاب چیز تھی۔ اور لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے کیلئے آیا کرتے تھے اس کے باپ کو ہر روز ریشماں کے واسطے کیلئے پیغام آیا کرتے۔ کوئی پانچ سو روپے، کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی سِن چلا تین ہزار روپے



تک دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا باپ شاید صرف نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا۔ کم از کم میں نے تو اُسے کسی سے ہمی بھرتے نہیں دیکھا نہ سنا۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ شاید وہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا۔ اور یوں ہی تو ریشماں کس بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی۔

لیکن، جیسا کہ میں نے کہا، جوانی بری بلا ہے اور جوانی کی محبت اس سے بھی زیادہ خطرناک، میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دنیا میں ریشماں صرف میرے لئے ہے اور میں اس کے لئے۔ اور یہ ٹھانی لی کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ لیکن اگر شادی ہوگی تو صرف ریشماں سے، نہیں تو جان پر کیل جاؤں گا۔ اس کے سارے خاندان کو ترہ تیخ کر دوں گا۔ سارے گائوں کو آگ لگا دوں گا۔ اس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے نالے میں کود کر مری جاؤں گا، لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہو گا کہ میرے جیتے ہی میری ریشماں کو کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیر دار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بیاہ کر لے جائے۔ جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے۔ یہ قوفوں کی سی باتیں۔ فضول خطرناک، عاقبت نا اہل ریشماں۔

تو صامب! میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑکی بازی لگا دی۔ لوگوں کو دیکھ دیکھ لگاتا کیا؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے

پہرنے لگا، پانگل کتے کی طرح، وہ چشے پر پانی بھرنے جاتی۔ تو بچے پہلے ہی  
 موجود پاتی۔ چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی تو میں بھی اپنی توڑ سے دار بندوق  
 لئے ہوئے جنگل میں آسجود ہوتا۔ میں ان دنوں گانا بھی اچھا مانتا تھا۔ میرا  
 مطلب ہے کہ میں مایہا بہت مزے سے گایا کرتا تھا اور اکثر لوگ میرے  
 مایہا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوئی مڑائی بھی اتنا  
 اچھا مایہا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وہ دن کہاں اب تو دن میں مجھے دس  
 بار کانسی کی شکایت ہوتی ہے۔ تم شہر میں رہتے ہو۔ کبھی کوئی اچھی سی دوا  
 ہی بیچ دیا کرو۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے پہنے کا ہیں کیا فائدہ کہیں؟  
 خیر..... ایک دن کی بات ہے میں کسی قریب کے موضع  
 سے چمچک کے ٹیکے لگا کر واپس آ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ اور مغرب  
 سے ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت منہموم تھا۔ کیونکہ دن بھر میں گاؤں  
 سے باہر رہنے کی وجہ سے ریشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا چنانچہ  
 بہت ہی حزیں لبو میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

”فراقِ باناں میں ستم نے ساقی لبو پیانے شراب کر کے“

گاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اس وقت بہت اداکس تھا۔ میری آنکھیں  
 شاید اس وقت آنسوؤں سے چمچک رہی تھیں۔ اہ مجھے اپنے آپ پر بہت  
 خیال آ رہا تھا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں

ایک خوابی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس خوابی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے اپنی سنہری کاکلوں کو اپنے نازک شانوں پر پریشان کئے ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمبے چند صدیوں کی طرح گزرے۔ پھر ریشماں بولی اپنی نرم میٹھی آواز میں۔ ”جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟“ میں نے کہا، ”اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، اور تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

ریشماں بولی، ”جی، مجھے سب سہیلیاں ملنے دیتی ہیں۔“ اور پھر اس طرح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں، میں آپ کو گالیاں دوں گی، تو پھر آپ . . . . .

میں نے کہا، ”تو میں نے کب منع کیا ہے آپ شوق سے گالیاں دیں۔ میں انہیں سنتا جاؤں گا۔ اور پھر انہیں اکٹھا کر لوں گا پھولوں کی طرح پھران کا دار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔“

ریشماں بولی، ”ہم ٹھیکس اُن پڑھ۔ بجلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بتانا کہاں سے آئیں۔ لیکن میں آپ سے پھر کہتی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا بچا کرنا چھوڑ دیں۔ اب آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں کہتے

تھے۔ اگر وہ لوگ باز نہ آیا تو اُسے قتل کر ڈالیں گے۔  
 میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”یہ سر خطر ہے۔ ابھی گردن اُڑا دیجئے  
 اگر اُن کر باؤں تو.....“

ریشماں نے ایک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا۔ ”اُس نے میں  
 یہ کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر..... آپ چاہتے  
 کیا ہیں۔؟“

”میں کچھ نہیں چاہتا۔“ میں نے اپنا ہاتھ اپنے کپڑے پر رکھ کر  
 کہا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمہارے  
 پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگا لوں اور تمہارا نام لیتا  
 ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔“

ریشماں مسکرائی، ایک لڑکی کی طرح نہیں، بلکہ ایک عورت  
 کی طرح مسکرائی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کھیلے مجھے دیکھا۔ پھر  
 وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما اور نازک گنگالوں پر جھک  
 گئیں۔ دوسرے لمحہ جنتے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی  
 جاتی تھی اور مرد مرد کی میری طرف دیکھتی باقی تھی۔

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن  
 کھڑا رہا۔ پھر میں نے بھی ریشماں کے پیچھے تیزی سے جاگنا شروع

کر دیا۔ وہ ایک حرفی کی طرح تیز جاگ رہی تھی۔ اس کے منہ سے نہیں  
کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے  
درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

اب میں اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ لیکن ابھی اُسے  
چھو نہیں سکتا تھا۔

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی۔

لیکن میں اب اُدھ بھی قریب آ گیا تھا اور ہمارے درمیان  
بالکل تنہا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔

”دیکھو، ہمیں ..... ہمارا پیچھا مت کرو..... میں

کہتی ہوں یہ اچھا نہیں.....“

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اُسے جا دبوچا اور آغوش

میں اٹھالیا۔ ”اب کدھر جاؤ گی؟“

”مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو..... میں گھر جاؤ گی“

اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر ٹک گیا۔ او

اُسے سبز روش پر آہستہ سے گرا دیا۔ ادھر اس کے قریب ہی  
سستلے کیلئے بیٹھ گیا۔

• دیکھا تم نے ؟ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں ۔  
میں نے منہس کر کہا ۔

وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی ۔

ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے ۔ شفق گم ہو چکی تھی  
لیکن پھر سہی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا ۔  
ہاں پہاڑوں پر اب جگمگ دکھائی نہ دیتے تھے ۔ اندھیرے کھ  
سیاہی میں غائب ہو چکے تھے ۔ کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے  
میں نے ریشماں سے پوچھا ۔ • تم مجھ سے کب نکاح  
کرو گی ۔ •

• کہیں نہیں ! •

• وہ کیوں ؟ •

• تم تلی ہو ۔ ہم مغل ہیں ۔ ریشماں نے شوخی سے کہا ۔

• اس سے کیا ہوتا ہے ؟ • میں نے ریشماں کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ۔ • کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ؟ •

• ہرگز نہیں ! •

• تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو ؟ •

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر کیا ایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

”میں آج خوب پٹوں گی۔ ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے لیکن یہ کہہ تو آئی تھی کہ میں غلام کے ہاں جا رہی ہوں لیکن اب دیر بھی تو بہت“

“.....“

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ ”تجھ ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پٹیا جائے۔“

ریشماں بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے“

میں نے کہا۔ ”ہاں“ کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مثل لادی ہو۔“

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا۔ پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

”تم کتنے ناٹھکے ہو۔“ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کیا ایک آسمان کے ستارے کھٹکھٹلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاند کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیر اثر ٹاپنے لگے ہیں اور

مغربی ہوا کے جھونکے چار کے تہوں میں چپ چپ کر غیر فانی زندگی کے گیت گارہے ہیں۔ میں نے ریشماں کی لمبی لمبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا۔ کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اور جب میں نے دفورِ شوق سے بے اختیار سو کر اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے اور دیکھتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور مین دونوں ہی احساس تھے۔ ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت۔

اس کے بعد آٹھ دس دنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح نہیں بتا سکتا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی ایک دل خوش کن خواب کی طرح گزر رہی تھی۔ جس میں میں اور ریشماں ہی تھے۔ کچھ عجب سی حالت تھی۔ شراب کا سانسہ، دلفریب نغموں کا سا سرور، سارا گاؤں جنت نظر آتا تھا۔ اور دور سے جاگیر دار صاحب کے پرانے محل کے برج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے۔ عجیب اور پُر اسرار، مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رحمتیاں، پرندوں کے چہچہے بے فکر گذریوں کے قہقہے ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں میرے اور ریشماں کھیلنے تاکہ شام کے بچپنے میں ہم دونوں چپ کر اور باہوں میں یا میں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں با میٹھیے



اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پُر زور جھٹکے کے ساتھ میرے دلغریب خواب کو منتشر کر دیا۔

میں اس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے جاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ ریشماں کے ظالم باپ نے اُسے جاگیر دار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو بھلے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے درپردہ مشورے ہو رہے تھے۔

جاگیر دار صاحب کا بڑا لڑکا بہت ادب و باش ہے۔ جس طرح جوئے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ ریشماں پر لٹو تھا۔ کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہو گا۔ بس ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالتے شروع کر دیئے۔ ادھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ جب ریشماں شہر میں جاگیر دار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی۔

یہ چون اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس پر قرار نہ رکھ سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد دو سال تک میں پائل ساربا۔ سوکھ کر بالکل کاٹا ہو گیا تھا۔ درپردہ گھومتا تھا اور لوگوں سے

کہتا تھا مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ وہ بچے کاٹنے کو آرہی ہے۔ بس یہی دو کلمات تھے جو ہر وقت میری زبان پر جاری رہتے۔

منا ہے کہ ایک دن جب میں جاگیردار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا۔ انہوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا۔ اور جب کسی صاحب سے انہوں نے میری رام کہانی سنی تو مجھ پر بہت ترس کیا۔ اور علاج کیلئے ہسپتال کے پگل خانے میں بھیج دیا۔ اور جب میں دو سال کے بعد مندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا۔ لیکن اس گاؤں میں نہیں بلکہ دور کے گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔

اتنا کہہ کر دیکھی نیٹرز چپ ہو گیا اور حقہ گونگوانے لگا۔ رشید نے آہستہ سے پوچھا۔

”اور ریشماں؟..... تم نے اسے پھر کبھی دیکھا؟“

”ریشماں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے۔ اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر مندر حاصل ہے۔ اس کے دو لڑکے بھی ہیں..... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے اس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی۔ اس کا باپ

اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبر دار ہے۔ اور علاقے کا ذیلدار۔ اس کا مکان پتروں سے بنا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا۔ وہ جس پرٹین کی چھت ہے اور جس کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے۔ . . . . میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ وہ اب بھی بے حد خوبصورت تھی۔ اس کی چال شہزادیوں جیسی تھی۔ میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

اریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی۔ ریشمیں کپڑوں کی بجائے وہ سرخ سوی کی بجاری شلوار اور چینٹ کی قمیص پہن کر میرے اپنے بچوں کو لے کر یوں ٹہلا کرتی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور اذخیں پونچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ میں نے اُسے سخت فحش کلمات کہے۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ اُسے کے سارے خاندان کو جی بھر کر اور تیغ تیغ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ملا۔ جب تک لوگ مجھے وہاں سے کیچنے کو اور گھسیٹ کر پرے دے گئے۔

• اور ریشماں نے تمہیں کچھ نہ کہا۔ • رشید نے پوچھا  
 • نہیں، مجھے دیکھ کر وہ خشک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گردن  
 جھکائی، اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے  
 آنسوؤں کے چٹے بڑھکے اور اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اپنے  
 دونوں لوگوں کو اپنے ساتھ چٹالیا۔ . . . . بعد میں جب وہ اپنے  
 گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس سوال  
 پر کوتم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں؟ •  
 ریشماں نے جواب دیا • اس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا  
 یا جان سے مار ڈالتا تو بھی میں وہاں سے نہ ہٹتی۔ . . . . پھر اس نے  
 کہا۔ اے میری جان سہیلی، وہ گالیاں نہ تھیں بھول تھے۔ میرے محبوب  
 کے جنہیں میں نے چن چن کر اپنے آنسوؤں کے تار میں پرو لیا۔ اور  
 اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا۔ تاکہ محبت کی قبر سوئی نہ رہے۔ . . .  
 لیکن دیکھی میٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے  
 ہوئے کہا۔

• مجھے اب کسی پر غصہ نہیں، کسی سے محبت نہیں۔ میں  
 اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ پہلے چمپک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا۔

اب دو آنے لئے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کچے پرواہ نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں۔ اس گاؤں میں سوائے ریشماں کے باپ کے، سب میرے قرض دار ہیں وہ مجھے کب خوش اور ظالم کہتے ہیں لیکن انہوں نے کب میرا جلا چا ہا۔ ان کا بس چلے تو مجھے آج قتل کر دیں۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں میرے پاس روپیہ ہے زمین ہے ہاں پتے میں تین نکاح کر چکا ہوں مجھے کسی کی پروا نہیں کسی سے محبت نہیں، کسی پر غصہ نہیں۔ میں جاگیر دار صاحب کی وفادار رہا یا ہوں۔ ان کا ظلم نہیں۔

”کیا سچ پر تمہیں کسی پر غصہ نہیں آتا؟“ رشید نے تیز

نگاہوں سے دیکھی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

دیکھی نیٹر گھبرا گیا۔ آنکھیں میچی کر کے بولا: ”نہیں سرگز

نہیں۔ میرا دل صاف ہے۔۔ لیکن دوست ....“ اب

دیکھی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور رشید کی طرف محبوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا ....

”میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اور اسے کہتے وقت

میرا سینہ پھٹا جاتا ہے اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا

اور وہ بات جاگیر دار صاحب کے اس پرانے محل کے برجوں کے

متعلق ہے۔ . . . . میں انہیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بار بار پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میل منہ چڑا رہے ہیں۔ میں انہیں صاف صاف کہتے سنتا ہوں۔ تم ہمیں نہیں جانتے۔ ہم اب بھی تمہاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ تمہارے امن و سکون کو غصہ و خاشاک میں ملا سکتے ہیں۔ تمہاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں تم ہمیں نہیں پہچانتے لڑ لڑا۔

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں، کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج سجدہ میں میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا بار بار میرے دل میں خیال آتا ہے کہ ایک دوپہے کا بارود دے کر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں اور بارود لگا کر بجھک سے ان برجوں کو اڑا دوں تو۔ . . . تو۔۔۔ لیکن میں نے ہر بار اس موذی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے۔ اور دیکھی میٹر نے راز دارانہ لہجہ میں رشید کھٹرون جھک کر کہا۔  
 ”لیکن ایک دن میں اس کام کو مندر پورا کر کے چھوڑ دوں گا۔۔۔۔“

# خوفنا چ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر  
گھر جا رہا تھا۔ ایک ٹریک اور ایک گھڑی جس میں گوجرانوالے کے  
سرخ مٹے اور کچھ پنوں کیلئے کھلونے بندھے تھے۔ بس یہ مختصر سا  
سامان تھا۔ جسے میں نے اترتے ہی کرایہ کے سالم تانکے پر لدوا لیا۔  
اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رخصت  
بھی آئی ہوگی۔ رخصت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملائمت اور اس کے  
محبوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آکر کہہ  
رہی تھی۔ "اوہ بھائی جان — آپ بھی آگئے — اب شو دھنا کا  
خونی ناپچ دیکھنے میں خوب لطف آئے گا۔"

جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شو دھنا کے رقص کے



متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ عجب ہوگی اور رفعت اور میں اور شوہن کا غنی ناچ۔ رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے۔ اور مردانہ نام ہو تو عارف، حقیق، محبوب، کچھ ہو لیکن صابر، صابر — یہ نام تو ایسا ہے۔ میا کسی چمڑا بیچنے والے دکاندار کا۔ ایک ایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا کہ گھوڑا گرتے گرتے پھا۔ اور مجھے تو گویا دن میں تارے نظر آ گئے۔ باب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی، بظرف جدید، قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف نکتا رہ گیا۔ میں نے سوچا کیا روانی ہے۔ زبان میں کس قدر لوچ ہے کسی پچھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔

شاہ عالمی سے میسر لوداری دروازے تک میونسپل باغ کے کڑی کے چنگے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کاہلی پٹان فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں پہنچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق ترقیاتی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سیلا کے منہ کے قریب تانگے والے کو فڈاڑک جانا پڑا۔ یہاں بہت بھڑکتی۔ بہت

سے لوگ جمع تھے اور دوپار پولیس کے جوان بھی۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ شرط بد کر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرائے تھے اور ایک مزدور جو بستر اٹھاتے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا۔ ان دو تانگوں کے بیچ میں آکر بڑی طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی خون میں لتھڑی ہوتی لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بد معاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا، اور بستر کے لبہ سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کراخت آواز میں ذکر کر رہا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر بلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”سب ان تانگے والوں کی بد معاشی ہے۔ دوسرا سپاہی بولا۔ اپنا نام کھاؤ لالہ جی۔“

جمع میں مختلف آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ ”ادھو۔ ادھو پچ پچ،

پچ، مرگیا بیچارہ۔“

گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں۔

”کم بخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی، مگر دیکھتے

اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہو گیا۔“

”اُف.....!“

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چکرٹے جمع ہو گئے دیکھتے

دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا۔ آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑکے درخت کے قریب "ہٹو مہربان، لالہ جی ایک طرف، خاں صاحب، سنتری جی، سائیں جی، اودھائی پنج جا" کہہ کر راستہ نکالا اور پھر گھوڑے کو جو چاہک دکھایا تو لوماری کے چوک میں پہنچ گیا۔ خواہنے والے کی صدائیں، اہاد کی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساریوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاصے پروگرام، ریجنٹ مین نور اسلام، کراؤن میں، بانگی الفٹ، الفشن میں، شاہی لیٹر، "راکسی میں، شانِ قلندر، پرہتا میں شودھنا کا ناچ۔"

شودھنا کا ناچ اور رفعت !

بھائی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا

"مجھے یہیں اتارنا ہے۔"

ایک مزدور نے دوڑ کر میرا سیاب اٹھایا۔ اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چار آنے لیکو گھوڑے کا رخ لوماری دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔

مزدور بولا ۔ اسباب اٹھاؤں ؟ جی !

۔ اٹھاؤ ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے

ایک آندیں گے ۔

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گھڑی

اٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

۔ ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو ؟

۔ جی نہیں، نیا نیا آیا ہوں ۔ اس کا لہجہ نہایت خوشگوار

اور دیہاتی تھا۔ شہری تصنع سے بالکل پاک ۔

۔ کہاں سے آئے ہو ؟

۔ ملتان سے ۔

۔ خاص ملتان سے ؟

۔ جی نہیں ملتان کے پاس پارو وال گاؤں ہے وہاں

سے آیا ہوں ۔ پہلے لائل پور گیا تھا ۔ پھر ماہر لاہور آگیا ہوں ؟

۔ کیا لائلپور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی ؟

۔ مزدوری تو — ملتی تھی مگر . . . . . بات یہ

ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی . . . . . ہم چار بھائی ہیں ۔ میرے

تین بڑے بھائی بیاسے ہوئے ہیں ۔ مگر میں کنوارا ہوں ۔ دو بڑے

بھائی پارودال میں کاشت کرتے ہیں۔ زمین تھوڑی ہے گزارہ نہیں ہوتا۔  
 مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری  
 کیلئے ملتان سے لائل پور منڈی آئے تھے اور ایک دن جب ہم  
 گھنٹہ گھر کے قریب سستارہے تھے۔ ہمیں ایک بالبو ملا۔ اس  
 نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا۔ ”مزدوری کرو  
 گے؟“ ہم نے کہا۔ ”کریں گے!“ بالو بیاں کیا لیتے ہو؟“  
 ہم نے کہا۔ ”آٹھ آنے روزانہ“ کہنے لگا۔ ”میں بارہ  
 آنے روزانہ دوں گا۔ لیکن تمہیں ملک وال میرے ساتھ چلنا  
 پڑے گا۔“

ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے  
 وہاں سے وہ بالو ہمیں سدھو وال لے گیا۔ راستے میں ہمیں تسلی،  
 دیا گیا کہ بڑا آسان کام ہے بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا۔  
 ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی۔ لیکن سوچا اس میں کیا  
 ہے کریں گے،

سدھو وال جا کر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال  
 تھما دی۔ اور ریلوے لائن پر لے گیا۔ اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ  
 یہ زمین کھودنی ہے اور جتنے فٹ زمین روز کھودو گے اس کے

حساب سے تمہیں پیسے ملیں گے۔ اس حساب سے میں بمبکل چار آنے روز ملنے لگے اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ لہو بارش ہو گئے۔ ایسی سخت مٹی مٹی تھی وہ، آخر ایک دن رات کو ہم دونوں بجائی جاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا۔ اور اکثر بیٹ بھی ڈالتا تھا۔ پھر مسم یہاں آ گئے یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں۔ وہاں بارہ بجے تک چار آنے ہو جاتے ہیں۔ پھر مسم دن بھر ادھر ادھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو بن گئے لیکن عام طور پر پانچ چھ آنے سے زیادہ روزانہ کما ہی نہیں ہوتی۔

میں نے پوچھا: تم رات کو سوتے کہاں ہو ؟

جی دانہ کے دربار میں ۔

وہاں جگہ ہے ؟

مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے اور پھر ہم انہیں

خوش بھی کر دیتے ہیں ۔

اچھا ؟

جی ۔

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا۔ تھا عبید سلنے مٹی میں کیل

رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توکی زبان میں چلا اٹھا۔ ”بھائی جان آؤئے“ اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

والان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گھٹری فرش پر رکھ دی۔ اور ایک طرف ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے اور پُرسرت لگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں و خالہ اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلا بھائی بولے۔ ”ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“

اماں بولیں۔ ”رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟“  
رفعت نے ہنستے ہنستے کہا۔ ”بھائی جان ہم تو آج ہی شوہن کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

مزدور کو سننے میں سے بولا۔ ”مجھے پیسے جلد دیجئے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کیساتھ بستر اٹھا کر گیا ہے۔ اور اب واپس آکر داتا جی کے دربار میں انتظار کر رہا ہوگا۔“ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ”کچھ انعام بھی مل جائے۔ کل حید کے بابو جی۔“

میں نے حب میں لٹھ ڈالا اور پھر کیا ایک میرا ہاتھ گر گیا میرا  
سارا جسم کا پنے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے۔  
رفت کی مسکراہٹ بھلتی ہوئی ساری فضا میں حب حلقے بناتی ہوئی  
دکھائی دی۔

شو دھنا کے قصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو زور زور سے  
چیننے لگے۔ ساری کائنات لہڑ رہی تھی۔ انارکلی میں گزرتے ہوئے  
تا نگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے فضا میں لڑھکنے لگے۔  
اب چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ اور دوپھرائی ہوئی آنکھیں اس میں  
سے باہر جھانک رہی تھیں۔ اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے  
بھنجنے کی گوبخ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اے ہے پچ پچ  
پچ بے چارہ مر گیا۔"





# دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، تو چار بجے تھے اور خواب گاہ  
 کی کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار بکھ دکاندار کی دکان سے  
 نکلے مٹی جی کے پاٹ کی آواز آرہی تھی۔ بجے سے صدق، عجز اور  
 پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا مٹھی ہوئی تھی۔ اس لئے  
 برابر چلی آرہی تھی۔ ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں  
 کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی۔

، مردود تھے اپنا خالق کا کچھ پاس نہیں، کیسی میٹھی نیند  
 سو رہے، شرم نہیں آتی تھے، دیکھ ستارے ماند پڑ رہے ہیں  
 مشرق سے روشنی پھوٹ رہی ہے اور میں اپنے قادرِ مطلق کی  
 تعریف کا گھٹ بن کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔ اٹھ اٹھ بے شرم

کا: ملید، دہریے، آواز اونچی ہو رہی تھی۔ تھراتی ہوئی لڑتی ہوئی گویا اپنے آپ کو ربِ عظیم کے آستانے پر نچا رہی تھی۔ میری کھڑکی کے اندر چلی آرہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے چوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پرے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آرہی تھی۔ اور اب تو گویا چلا چلا کر کہہ رہی تھی، اٹھ اٹھ :

”اٹھ فریاد ستیا تے من دادیوا بال“

(اے سوئے ہوئے فریاد اٹھ اور دل کا پھرانع روشن کر لے)

گو میرا نام فریاد نہیں لیکن پھر میں نے اب بھی مناسب سمجھا کہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر پڑے ہوئے ٹیبل لمپ کو روشن کر دوں۔ جب کمرے میں اجالا ہو گیا۔ تو روشنی اور آواز دونوں نے مل کر نیند کا میٹھا تکین وہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دور کر دیا۔ اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور جھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔ ایک زناٹے وار آواز آئی۔

”اٹھ فریاد ستیا تے من دادیوا بال“

• صاحب جنھاں دے جاگدے نغراں کی سونے نال •

(اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اسے ہرے کے بچے تھے  
سونے کا کیا حق ہے ،

بالکل درست ، پیرو مرشد ، بالکل درست ، آج کی خطا معاف

ہو ، کل اگر چار بجے سے پہلے ہی ڈانٹوں تو پھر ————— بھلا  
آپ کی آواز ہی مجھے کیوں چین لینے دے گی ۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے سکھ دکاندار کی دکان  
پر کوئی جھاڑو دے رہا تھا ۔ ٹین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا ۔  
آٹے اور دال کی بوریوں کو اٹھا اٹھا کر ترینے کے سجا رہا تھا ۔ یہ وہ  
پیارہ کوتاہ قد زرد رو سکھ دکاندار تو نہ تھا ۔ یہ تو کوئی اور تھا ۔ شمع  
کی ہلکی سی لومیں اس کی لمبی پرچائیں ، اس کا چست پانجامہ اور کانڈھوں  
کے گرد لپٹا ہوا کھیس نظر آ رہا تھا ۔ یا پھر وہی صدائے برحق ۔

• گنگن گاویں تے من بھاویں • (اپنے گورو کی تعریف  
کر تاکہ تو اس کے دل میں گھر کر سکے ،

جی !

گنگن گاویں تے من بھاویں

جی !

جی ! بالکل درست ، پیر و مرشد ، بالکل درست ، اگر میں اپنے دفتر کے پسر ٹنڈنٹ کی دن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک ایٹ اے فیل " ہو کر پھتر روپے تنخواہ نہ پاتا ۔

• جی ، ست سری اکال ! " اب وہ لمبی پرچھائیں دکان کے باہر آگئی تھی جس نعرے نے گور و ناکہ نگر کے در و دیوار ہلادیتے تھے ۔ وہ نعرہ میری کھڑکی کھل دیکھ کر ہی لگایا گیا تھا ۔

• آہا ، بالوجی ، آج تو آپ " بڑے سویرے " اُٹھ بیٹھے ۔

لمبی پرچھائیں نے کہا ۔  
میں نے مسکراہٹ کی کوشش کی ۔

• بالوجی ، سویرے اٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے ۔ اب تو خیر بہت اُجالا ہو گیا ہے ۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی ۔ گھنٹا ٹوپ اندھیرا ابھی تو چار بج رہی تھی ۔ ستارے چمک رہے تھے اور بجلی کے کیمبوں پر قہقہے بھی ۔ اُجالا کہاں ہے ۔ میں نے سوچا ، پھر خیال آیا ۔ کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں ۔ تو بے وقوف انہیں کیا جانے ! جس کے دل میں اُجالا ہوتا ہے ۔ اُسے ہر طرف اُجالا ہی اُجالا دکھائی دیتا ہے ۔

میں نے پوچھا، یہ — دکان کے — نند سنگھ

جی کہاں ہیں؟

گھر پر ہی میں جی، وہ تو ابھی سو رہے ہوں گے جی، میں نے سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہوں تو کچھ سیوا ہی کر لوں، کر سیدا کھا میوہ۔ میرا نام درشن سنگھ ہے جی، میں نند سنگھ جی کے بڑے سارے کا بڑا لڑکا ہوں، جی، میں نورپور میں گزرتی ہوں۔ نند سنگھ جی ذرا بیمار رہتے ہیں۔ انہیں مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔ واجپورو مہاراج سب کا بھلا کرے تو — انہوں نے بچے یہاں بلا لیا ہے ذرا دکان کے کام کاج میں مدد مہربانی ہے۔ میں یہیں دکان پر سویا کروں گا۔ واجپورو، واجپورو، اب تو دن چڑھ گیا ہے۔ اوبھنے اوبھنے، اٹھ دکان کھول، کیا دیکھتا ہے۔ دن کبھی کانٹل آیا ہے۔“

درشن سنگھ بھنے کو آوازیں دینے لگا تھا۔ بیچارہ بنیا

اس مکان کی غلی منزل میں جہاں میں رہتا ہوں۔ آٹا، لون، تیل، بھڑی سوڈا واٹر، اور پکھڑے بیچتا ہے۔ اس کی بیوی کا رنگ ذرا کھلتا ہوا سا ہے۔ اور وہ ہمیشہ عینا کی طرح چہکا کرتی ہے۔ دکان پر کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے، نگو کے



بنیا اپنی پیٹے ہوئے رُصول کی س آواز میں گار مارتا تھا۔ وہی صدق  
عجز اور پاکیزگی، لیکن کچھ خاص قسم کی تیزی۔ جو گویا درشن سنگھ سے کہہ  
رہی تھی۔ تم ہمیں کیا سمجھتے ہو، ہم تم سے بیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا  
کچھ کم پیارا نہیں۔  
اوہ نہ !

اور اب بنیا اور اس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جلی  
آوازوں کیساتھ کہہ رہے تھے۔  
"جگت پنن کے سکٹ پنن میں دور کرے"  
(وہ اپنے جھگڑوں کے دکھ ایک پل میں دور کر دیتا ہے۔)

اوم  
جے جگدیش ہرے اے اے۔  
اور بننے کی بیوی کوئل کی طرح کوک کوک کر کہہ رہی تھی۔  
تم بن اور نہ دوجا۔  
تم بن اور نہ دوجا۔  
آس کروں جس کی۔

اوم جے جگدیش ہرے ہرے۔  
ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنے



سے اونچی آواز میں کہا۔  
 ”بنیادی، آٹا دا گجور دکان نام لینے میں کتنا آند ہے ؟“  
 بننے نے پرخسوس بے میں کہا۔ ”آٹا رام کی مہا —  
 اور پھر اکھیں بند کر لیں۔“

دشمن سنگھ کے آتے ہی گھر میں دھرم کرم کے چرچے  
 ہونے لگے۔ یہ گجور لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصہ ہے یہاں اس نے  
 کوئی خاص مذہبی مجلس قائم نہ ہوئی تھی۔ لے دے کر ایک سنگھ سبھا  
 تھی۔ جس کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا۔ جس مکان  
 میں میں رہتا تھا۔ اس سے بس دس پندرہ قدم آگے جا کر مغرب کی  
 طرف ایک مسلمان قلعی گھر، ایک مسلمان رنگساز، ایک مسلمان حکیم اور  
 ایک مسلمان سائیکل کے مستری اور ایک مسلمان بھڑی فروش کی دکانیں  
 تھیں۔ ان سے آگے کھلی جگہ تھی۔ جہاں اکھاڑ بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ  
 مسلمان، ہندو اور چار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کشتی لڑا کرتے تھے  
 لیکن دشمن سنگھ کے آتے ہی لوگوں میں گویا صدق و ایمان  
 کی روح پھونکی گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد  
 مسلمان رنگ ساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نور ایمان مرقہ دلوں میں تازہ

کیا جائے۔ چنانچہ اب کچھ دنوں سے اس کی دکان پر ایک سبز منگوں والے اور سبز بچے والے پیر جو بیک وقت پیر اور مولوی اور عامل تھے تشریف لانے گئے۔ اب رنگ ساز کی دکان پر ہمیشہ ایک بمبکٹا سا لگا رہتا تھا اللہ اکبر کی مدائیں بند ہوتی تھیں اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان لڑکے یا علی یا علی کرتے اور خوشی سے ناپتے ہوئے گزر جاتے تھے مسلمان سبزی والے کا تمباکو کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بننے کی دکان پر پچوڑیاں کھاتے — دیکھ کر غصے میں آکر پٹنے لگے۔

پھر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولے: ”یہ کم بنت ہیٹھ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے اسے سو بار سمجھایا ہے۔“

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے ٹھکا ماندہ ، واپس آ رہا تھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ نگر کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے اور بازاروں میں سنگھ سبھا کے والیٹر ٹولیاں بنائے جگہ جگہ کھڑے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں۔ اکثر لوگ پان چہارہے ہیں۔ تھپتھپے لگا رہے ہیں۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بس کر پائیں پہنے ہوئے ہیں اور آبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں۔ یا

کھٹے کپالو، ریا پٹیلوں میں جبی ہوئی سرخ سرخ پینی گھاس کی کیر،  
 درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا بے کارہ  
 گھایا۔ آہا، بابو جی، آج بابا جی رہا ہو گئے۔

کون سے بابا جی ؟

۹ واہ۔۔۔۔۔ آپ کو بھی پتہ نہیں، آپ تو روز اخبار  
 پڑھتے ہیں۔ وہی داگجرو جی کے پچھے خالہ بابا نیک سنگھ جی۔  
 بنے کی دکان پر کھڑے ہوئے ایک والیٹر نے کہا۔ زغہ شہید  
 بابا نیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں۔ آج ہم ان کو اینڈس دیں گے۔  
 بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں نے کہا۔

ساتھ داسے مسلمان قلمی ساز کی دکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا  
 ہوا تھا۔ اوند گرا گرم۔ بحث ہو رہی تھی۔

دوسرے دن میری نیند روز کی طرح اچاٹ ہو گئی۔ لیکن  
 باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا۔ مکان کے دوسرے  
 حصے میں میری طرح ایک اور کرائے دار رہتا تھا میری ہی طرح ایک  
 دفتر میں ملازم تھا۔ اور اب وہی منہ اندھیرے اٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا۔  
 ٹو بنے کے قریب وہ مجھے میٹرھیوں پر ملا۔ میں نے  
 ایک پھکی سکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ آج تو آپ صبح

ہی اٹھ بیٹے ۔

”ہو ہو ہو“ بابو جی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اٹا ہا اٹے مہا تاجی  
 کاریکارڈ بہت پسند ہے۔ آپ کو پتر ہے۔ مہا تاجی کو یہ گیت خاص  
 طور پر پسند ہے۔“  
 ”کونسا گیت۔“

”یہی جس کا میں مس — ریکارڈ بھارا تھا۔“ اٹھ جاگ  
 مسافر بھر بیٹھی۔ ”کیسا میٹھا گیت ہے۔ اسے مس سن کر طبیعت بشک  
 ہو جاتی ہے۔“

اور پھر وہ بہ گنگنا تا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اڑ گیا۔

”اٹھ جاگ، اٹھ جاگ، مسافر بھر بیٹھی، اب رین کہاں، جو

سوت ہے اے۔ اے۔“

پرسوں ایک مادہ ہو گیا تھا۔ گوشت سے بھرے چکڑے  
 یا تانگے بوچھڑ خانے سے آتے ہوئے اسی طرف سے گزرتے ہیں  
 میونسپلٹی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے اکثر  
 چکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور  
 کئی بار گوشت زمین پر گر جاتا ہے۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ۔

سکھ دکاندار کی دکان کے سامنے الٹ گیا۔ اور گوشت دکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ تانچے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو پریم سجا کے سیکرٹری میرے پاس آئے۔ اور بولے۔  
 "اس کا تدارک ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے منسلک کو لکھ دیجئے۔"  
 بولے۔ "نہیں آپ میری بات نہیں سمجھے۔ یہ راستہ ہی بوجڑوں کے لئے بند ہو جانا چاہیئے۔ یہ منہد و سکھ آبادی ہے۔ ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے آپ دیکھیے نا، یہاں چوٹے پنچے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں اگر کسی کے چوٹ لگ جائے اگر کوئی مر جائے تو —————"  
 میں نے کہا یہ تو درست ہے مگر بوجڑ خانے کا بھی تو یہی راستہ ہے اور —————۔

پریم سجا کے سیکرٹری بولے۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کیلئے ایک مسودہ بنا دیجئے۔"  
 میں نے کہا۔ "یہ پریم سجا کب بنی ہے؟"  
 وہ بولے۔ "تین چار دن ہوئے۔ یہاں چار پانچ جہنڈے لے مل کر بنائی ہے۔ آپس میں مل بیٹھا اچھا ہوتا ہے۔"

• پنڈت مسودہ دیو کے دو بیکھر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے  
 ہوئے تھے آپ کہاں رہے؟  
 • میں؟ — میں نے کہا۔ "نکس مسنون پر بیکھر  
 ہوئے تھے۔"

• جا پان میں ویدک دھرم۔ "نہایت اعلیٰ بیکھر تھا۔ پنڈت جی  
 نے ثابت کر دیا کہ ساری دنیا ویدک دھرم قبول کرنے کو تیار ہے۔ مگر  
 ہم لوگ بہت سست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دنیا میرے  
 اپنے پرچارک بھیجنے چاہییں انہوں نے بتایا کہ.....  
 میں نے کہا۔ "میں کل آپ کو مسودہ تیار کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا۔ ہندو۔ مسلم سکھ  
 فساد، خوب گھمان کی لڑائی ہوئی، ساری نوآبادی میں جہر اس پھیل گیا  
 ہاتھ دکتے پر کرپانوں اور چھریوں سے حملے ہونے لگے۔ سکھوں کی کرپانوں  
 نے، بوچھڑوں کی چھریوں نے پوریوں کی لاشوں نے خوب داؤد شہادت  
 دی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک فحشے بلند ہوتے رہے۔

پریم سبھا کے سیکرٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا  
 کہ بوچھڑوں کو اس بازار میں سے گزرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔  
 بوچھڑوں نے سر بازار کہہ دیا تھا کہ "صبح اسی سترک پرست

گزرے گے اور مزد گزریں گے اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انہیں روکتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی بوجہ اپنے چکڑوں اور تانگوں پر گوشت لاوے ہوئے گزرنے لگے۔ بھی خاموش تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انہیں روکتا۔ کہ اتنے میں دشمن سنگھ نے لاکارا۔

• ٹھہر جاؤ۔ اور کرپان لے کر میدان میں آگیا۔

مسلمان رنگ ساز نے کہا: • اللہ ہو۔ اکبر۔

نیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا۔ وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی خلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرادیا۔ اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑی میں آ بیٹھا لیکن ذرا ہٹ کر، تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آگئے۔

پریم سجا کے حمایتی پوریوں نے بلہ کر کے مسلمان حکیم اور رنگ ساز اور ساگیل اور مہتری والے کی دکانیں لوٹ لیں۔ سکھ اور بوجہ لڑ رہے تھے۔ اتنے میں گھاٹی دروازے سے ملک پہنچ گئی۔ اور مہنت نگر سے پھرے ہوئے ہندو بھی۔ میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کر دی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں۔ نیچے کی دکان توڑی جا رہی تھی۔

پہنیں، ورد تاک، ہیبت تاک، چمنیں، نعرے، ٹلک ٹلکات  
نعرے، لاشیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دوازے ٹوٹنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد ایک نعت چاروں طرف موت کی سی  
خاموشی چھا گئی۔ اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے  
محلوں نو آبادیوں اور شہر کی گلیوں کو چوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا  
وہ وہ نغروں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں نسکین بیاں —  
موت کی سی خاموشی تھی۔

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی  
کا پٹ کھول کر دیکھا۔

دکانیں لٹی پڑی تھیں۔ اشیاء بازار میں بکھری ہوئی تھیں۔  
چند بوچھا اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے  
جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا۔ اور اس کی بیوی بھی، جو اسے پہانے  
کی کوشش میں بڑی طرح زخمی ہو گئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے  
پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری  
آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن پختی منزل میں  
راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل صاف کر رہا



تھا کہ وہ بے قاشا بھاگتی ہوئی آکھڑی ہوئی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ ،  
 رنگین کن رے والی دھوٹی اور سڈول بازو ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا تھا  
 کہ ساری دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی ہے ۔ اور پھر دوسرے  
 لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہو گئی تھی ۔ لیکن اس کی  
 وہ حسین تصویر ، وہ رنگین پرچائیں ایک عرصہ تک میرے آئینہ دل  
 پر لڑتی رہی تھی ۔

### ادب ۶

جب میں نے پھر کھڑکی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا ماسٹری  
 اپنے نوجوان لڑکے کی لکاش کو اپنے کانڈوں پر اٹھانے کی کوشش  
 کر رہا تھا ۔



فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے ۔ اب یہاں امن امان ہے ۔  
 فجو اور ماما دین کو پچاسی کی سزا ہو چکی ہے ۔ بنیا اپنے بال بچوں  
 کو لیکر رہتک چلا گیا ہے ۔ بوڑھا ماسٹری جس کے دونوں بچے فساد  
 میں ہلاک ہو گئے تھے ۔ اب گردن جھکائے سائیکل درست  
 کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں ۔ نند سنگھ نے مجھے  
 ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل شکار پور میں گرختی ہے ۔ اور

اب اس نے اپنا نام شکسہدین سنگھ رکھا ہوا ہے مسلمان رنگہ زرنے کہا۔  
کہ سبز چرخے والا مولوی آجکل جلال پور کی مسجد میں امام ہے۔ اب آہستہ  
آہستہ لوگ ایک دوسرے سے اسی طرح ملنے جلنے لگے ہیں۔

بدیم سبھا کا سیکرٹری، اب رادھا نگر میں رہتا ہے۔ بوچڑ  
لوگ گوشت کو ڈھانپنے ہوئے اسی طرح مشرک پر سے گزرتے  
ہیں۔ مشرک پر میسپٹی کے گڑھے اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن تعزیری  
پولیس مندر تعینات کر دی گئی ہے۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابو جی، جو دوسرے  
حصے میں ہیں۔ اب ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ  
گئے تھے۔ اب کوئی دل کا چرآنخ۔ روشن کرنے کی کوشش نہیں  
کرتا۔ اب بالکل امن ہے۔ لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر صفحہ  
شکار پور اور جلالپور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں !!!



# سفید پھول

موضوع مہنڈ کے موپی کا نام کبالا تھا۔ کبالا کو آج تک کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا تھا۔ طبی شرافت کے علاوہ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ پیدائشی گونگھا تھا۔ یوں بھی تو مہنڈ کا گاؤں بودھوں کا گاؤں تھا۔ جہاں ہر ایک فرد سچائی اور اپنا کاپرباری تھا۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی کا نام تک نہ تھا۔ پچھلے دو سو برس میں وہاں قتل کی ایک سہی واردات نہیں ہوئی تھی۔

لوگ مہنڈ میں اس طرح خوش و غرم رہتے تھے جیسے جنت میں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی الجھنوں میں پھنس کر گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے۔

جن پر انھیں بعد میں پھٹتا نا پڑتا تھا۔ لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں اور پھر یہ تو سماج کی انھنوں کا قصور تھا۔ نہ کہ ان کا۔

کبالا کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دیو دار کے دو - مضبوط درختوں کے سائے تلے، لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ اور یہ کبالا کی دکان بھی تھی۔ اور اس کا آبائی گھر بھی - مہندر کا خوب صورت گاؤں نیچے تلٹی میں واقع تھا اور جب ہوا دیو دار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گاتی اور سودج دیوتا اپنے سنہری رتھ پر سوار ہو کر اونچے دیو داروں کی چوٹیوں کے اوپر سے گزرتے تو نیچے تلٹی میں گاؤں کی خوبصورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا سنگولی برج شام کی سنہری کرنوں میں جگمگ جگمگ کرنے لگتا۔

سودج بکلتے ہی کبالا دکان کے باہر ایک چوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ بیٹھا اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دور نیچے راستے پر گزرتی ہوئی مہینوں کی طرف دیکھتا۔ جو مٹی کی گاڑیاں گولھو پر رکھے یا سر پر اٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی جاتی تھیں۔ اور جب وہ پگڈنڈی پر سے گزر جاتیں۔ تب بھی وہ اُن

ہی کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت کبال کو ایسا عمسوس ہوتا گویا ان کے  
 پاؤں سے چھوہلنے سے راستے کی مٹی کا ہر ذرہ کندن بن کر دمک  
 رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اس کے دل کے  
 اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھینچ جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا  
 کہ وہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دور نیچے راہ چلتی ہوئی  
 ماہ جبینوں کے پاؤں رک جائیں اور وہ نازک اندام سر و قد ڈینا  
 گاؤں کے نمبردار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پر رکھے اور دوسرے  
 ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آچھل سنبھالے اس کی طرف تکنے لگ جائے۔  
 اور ..... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں اڑتے  
 ہوئے بادل یکا یک تھم جائیں اور اس کا پر سوز گیت سننے کیلئے  
 اپنے اپنے دیو داروں کے اوپر جھک جائیں — لیکن  
 جب کیا لا اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک دہنی سی  
 چٹ نکل جاتی، کرخت اور بند، جسے سن کر اس پاس کے درختوں پر بیٹھے  
 ہوئے نازک مزاج ککو، منہ بولے اور رت گلے پر پھڑپھڑاتے ہوئے  
 اڑ جاتے اور کبالا خرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بیخی لیتا۔ جیسے  
 انہیں سوت کے ٹانگوں سے اس نے خود ہی سی دیا ہو۔  
 کبالا کی صورت شکل بہت اچھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی

آنکھیں کسی وحشی ہرن کی سی تھیں اور چہرہ بیضی، اور جب وہ اغروٹ کے درخت کے تلے زانو تہ کئے جوتے بار بار ہوتا تو اس کا پاک اور معصوم چہرہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا۔ صورتیں کس قدر دھوکا دیتی ہیں۔ کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی سوجی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بدو سادھو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ کیونکہ اسے شک تھا کہ بودھ سادھو اس لڑکی کو درغلارہا تھا جس سے کبالا کے اس بزرگ کو محبت تھی۔

گھاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے دوسرے کی جان لینا اُدھرم ہے۔ اس لئے انہوں نے کبالا کے بزرگ کو گھاؤں سے باہر نکال دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا۔ کہ جب تک اس خاندان کے سات پشیتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر لیں۔ اس خاندان کے کسی فرد کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ گھاؤں کی حدود کے اندر قدم رکھ سکے۔ اس دن سے لیکر گھاؤں کے سوپی کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی۔ گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا

برف چارپشتوں سے مہنڈ کے موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا۔ وہ بہت سی چیزیں کھنیتر کے گاؤں سے لے آتا تھا جو مہنڈر کے کوہساروں کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا اور اب تو کھنیتر کے موچی خاندان سے مہنڈر کے موچی کے قطعات اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ مہنڈر کے موچی کا خاندان بودھ خچوں کی سزا کو قریباً بھول گیا تھا۔

ہاں! نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی تمس اٹھتی کیونکہ وہ نوجوان تھا اور اکیللا اور گونگلا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور کھنیتر کے موچی خاندان کے افراد اس کے گونگلا ہونے کی وجہ سے اس سے متنفر تھے اور ان کی اور ذی شہی دلوں بہنیں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کی دلچسپ حرکات کی جن سے وہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا بغلیں اٹارتی تھیں اور جب ان کے ہنسی ٹھٹھے میں اُنکے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہو جاتے تو گونگے کے دل کا زخم دس دس کر بنے لگتا۔ اور وہ چنچیں مار کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا اس کا نام تھا کھنڈا۔ کبالا نے کھنڈا کو ایک دن کھنیتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا۔ وہ جوک سے بیتاب ہو کر چلا رہا تھا۔ اس کی ڈان ماں اُسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا کھنڈا کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اُس نے



اسے پال پوس کرتا تھا کیا تھا اور کھنڈا بھی کبالا کو بہت چاہتا تھا، کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اس دیکھتا تو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف تاکت اور پھر دم ہلا کر اس طرح چیخا گویا کہہ رہا ہے، گونگے بھیا کیوں اس سے ہو میری طرف دیکھو۔ میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پر کسی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے اسے لو وہ اڑ گئی اور پھر کھنڈا پختے پختے کبالا کے قدموں کے گرد ٹاپنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غم دور ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر ہلاکت آ جاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے ٹکارتے اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں کھنڈا بھی اتنا بہت شوخ ہو، شوخ اور پیارے۔ شرمیلی تو اروائی اور ذی شہ میں بھی ہے لیکن وہ پیاری نہیں ہیں اور دنیا میں شہرت نہیں۔ پر وہ بہت اچھے ہیں، کیا تم دنیا کو نہیں جانتے وہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ اور اس دن اپنے باپ کیساتھ یہاں آئی تھی۔ نہیں جانتے؟ ذیل کہتے، چلو ہٹو یہاں سے۔ اور کھنڈا غرا کر کہتا۔ مجھے نمبردار کی کیا پروا ہے اور میں کسی دنیا کو نہیں جانتا اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتے۔ میں جنگل کے بھڑیے کی مانند ہوں مجھے کوئی معمول ایسا ویسا گناہ سمجھنا! سچ ہے۔ جب کبالا نے دنیا کو پہلے پہل دیکھا تو اس دن دھند

چھائی ہوئی تھی۔ ایک ہلکی لطیف دُھند جو دیو دار کے درخولی کو اپنے سفید کبار  
 میں پیٹے ہوئے جنگل کی سبز جھاڑیوں سے لیکر چوٹی کے اوپر آسمان میں پھیلے  
 ہوئے بادلوں تک چلی گئی تھی۔ ساری فضا میں صبح کا سناٹا قائم ہوا چل رہی  
 تھی۔ پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ جب دُھند آجائے تو  
 پرندے بھی خاموش ہو جاتے۔ اس گونگی دنیا میں کبال پہاڑی بھرنے سے  
 نہا کر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان پر کھڑے ہوئے اس نے  
 دُھند کی دیوی کو دیکھا۔ وہ یہ دُھند کی دیوی ہی تو تھی۔ سرو قامت، سر سے  
 پاؤں تک ایک سفید دھوتی میں ملبوس۔ اس کا چہرہ کبال کو ایسا معلوم ہوا گویا  
 شبنم کے قطروں میں دھلا ہوا گلاب کا بھول دُھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا  
 ہے۔ وہ ٹٹٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔  
 دُھند کی دیوی نے کہا میں رستہ بھول گئی ہوں میں نینا ہوں مجھے گاؤں  
 کا رستہ دکھا دو۔ کبالا چند لمحوں کیلئے بت کی طرح کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے نیچے  
 مڑ گیا۔ اس نے نینا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا دُھند  
 گہری ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کبالا سوچ  
 رہا تھا تم نینا ہو۔ تم دُھند کی دیوی ہو۔ تم رستہ بھول کر آ گئی ہو۔ رستہ، کبالا نینا  
 کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں؟ اچھا تو وہ  
 چل کیوں نہیں پہنتے ہوئے؟ وہ اب ایک ایسا اچھا چل تیار کرے گا

کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے پہلا سا چمڑا اور اس پر  
 باریک نقرتی تاروں کے پھول، خوبصورت اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں  
 اس کا جی پاؤں کہ وہ دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور بچے کہ اپنے  
 بیماری کو ان کی پوجا کر لینے دو اور پھر کیا ایک اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ بھی  
 نہیں کر سکتا اور وہ اس رازِ عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے  
 کو تیار ہو گیا۔ اب چلتے چلتے اسے ہر لمحہ ڈر رہنے لگا کہ نینا اس سے کوئی  
 بات نہ پوچھے ایک بات، ایک لفظ، اور پھر وہ جان لے گی کہ وہ گونگا ہے  
 اور قدرت نے اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا ہے خاموش اور ہمیں، شاید پیدا ہونے  
 پر وہ ایک بار چلایا ہوگا۔ لیکن اب تو گویائی کی ایک رمت بھی باقی رہتی اور اس کا  
 سانسِ حیات بالکل ہمیں بیجان اور موت کی طرح ساکن تھا۔ گلوں کی صد کے قریب  
 پہنچ کر کبالا کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے دھند میں پلٹے ہوئے  
 راستے کی طرف اشارہ کیا۔ نینا نے ایک لمحہ کیلئے رک کر پوچھا: تم کون ہو؟ کہاں  
 سے آئے ہو؟ میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کہاں رہتے ہو؟  
 کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور آٹھیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔  
 چند لمحوں کے بعد نینا بولی اویہ.... تم کو کہاں؟ کبالا دیر تک محروں جھکائے  
 ہاتھ دکھائے کھڑا رہا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی برن کی  
 سی آنکھوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ وہ کیا کہتا پتا بتا تھا؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا کاش

وہ کچھ کہہ سکتا۔ نینا آہستہ سے مڑ گئی۔ سپید و عنعنہ میں اس کی ٹھنکی ہوئی تصویر کو کچھ کر کبالا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جس دن نینا رستہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آئی تھی۔ اس دن کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے دین کے سونے ہوئے سب پسینے جاگ اٹھے ہیں مہنڈر کے خلیہ زاروں میں ایک نئی روحانی اور دل کشی آگئی ہے اور اس کی روح میں خوشی اور شہم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے مل گئی ہیں شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اب جب کہ اس کے جذبات کے سیل بیکراں کے چاروں طرف قدرت کے لگے ہوئے آہنی بند دیکھے تو اس کی روح کی تڑپ اور شہرت اس کی بنائی ہوئی چپلوں اور جوتیوں میں منتطب ہو گئی۔ ان دنوں اس نے چپلوں اور جوتیوں کے ایسے ایسے نفیس اور نادر نمونے ایجاد کئے۔ اس کی شہرت بہت جلد اطراف میں پھیل گئی۔ اور لوگ دور دور سے آکر اس سے جوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھنیر کے موچی نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جبکہ تمہاری دکان چمک اٹھی ہے تمہیں خادی کر لینی چاہیئے۔ اور اب وہ بغیر کسی معاوضے کے کبالا کو لہوائی یا ذی شی کارشتہ دینے کو تیار تھا۔ ذی شی اور لہوائی بھی

تو اب اسے اتنا دق نہ کرتی تھیں اب ان کی نگاہوں میں شوخی کیساتھ احترام یا شاید کچھ اور جذبات بھی ملے ہوئے تھے شاید اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا غامد سمجھ رہی تھیں اب انہیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیوتاؤں کے سے چہرے میں، دل آویز رنگت میں اور لمبے گھٹیلے جسم میں جرات مہرنگی اور خوبصورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے جس طرح تالاب میں کافذ کی ایک مٹی سی ناؤ ڈال دینے سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر وہ بڑھتی ہوئی دائرے بناتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح کبالا کی محبت کی ناؤ نے بھی منہ بڑ کی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور اب یہ لہریں چاروں طرف پھیل گئی تھیں کھنڈ کو اس بات کا پتہ لگ گیا تھا۔ نینا کی سہیلیوں کو اور شاید گاؤں کے اور افراد کو بھی جب گاؤں کی دو شیرائیں نینا کو چھوڑتی تو نینا کو کبالا پر بہت غصہ آتا تھا۔ بیوقوف کو نگھانا گل چار نہ جانے وہ اسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھی۔ اور ہمارے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہوا ایمنا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا اس نے نینا کو تاشی پور کے بودھ سردار سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے تین ہزار روپیہ پر فیصلہ ہوا تھا۔ تاشی پور کا سردار بہت کمزور تھا۔ اور دو ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ تب نینا کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تاشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی چھٹی بیٹی کو جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے۔ وہاں تاشی پور جہنم سے کم نہ تھا۔

لوہے اور پختے سنگلاخ پہاڑ و شوالہ گزار راستے ہر وقت برف و باران ہماشی پورے برف کا جہنم تھا۔ وہ یقیناً اپنی نازک اندام بیٹی کو ہماشی پورے کے بدھ سردار سے نہیں بیاہے گا۔ آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پرفیلہ ہوا تھا۔ لیکن کبالا اپنی جگہ خوش تھا۔ نینا دوبار اپنے باپ کیساتھ اس کی دکان پر چلوں کا ماپ دینے آئی تھی۔ نینا کے لئے اس نے ایسے خوبصورت چل تیا کئے تھے جنہیں دیکھ کر گاؤں کی دو شیرائیں رشک سے جل گئی تھیں۔ نینا کے پاؤں کو جنہیں تھپتھپانے خود اپنے ہاتھوں سے بلایا تھا چھو کر کبالا کے دل میں یہ خواہش آگئی کہ اس طرح بھڑک اٹھی تھی کہ وہ ان دو کنول کے پھولوں کو اٹھا کر اپنے سینے میں چھپائے۔ نینا کے باپ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بدھ پنچوں کو کہہ کر کبالا کے غامدان کی سزا منسوخ کرانے کی کوشش کرے گا اور غالباً جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی اجازت مل جائے گی اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اٹھیں گی۔ اور اس نے نہایت متعینانہ انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ وہ ضرور غریب کبالا کے غامدان کی سزا منسوخ کرادے۔ ان باتوں کو یاد کر کے وہ جوتیاں بناتے بناتے خود ہی مسکرا پڑتا۔ ہاں وہ بہت خوش تھا۔ وہ دن بھر اپنے اپنے چل بناتا۔ کھنڈا کیساتھ کھینتا اور صبح و شام اخروٹ کے درخت تلے کھڑے ہو کر دور سے بچے گھاٹی کے سنہری راستے پر گزرتی ہوئی ماہ جینوں کی طرف

دیکھا۔ ان میں نینا بھی ہوتی تھی پہلے آپنل والی نینا۔

اور پھر ایک دن گناؤں کے لوہار نے کہا لا کو بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بدھ سردار سے ہوئی والی ہے شادی ادنیٰ پور میں ہوگی جو منہڈر اور تاشی پور کی درمیانی حد پر اونچے برفانی پہاڑوں کی ایک تنگنائے میں واقع تھا۔ شادی کی رسوم ادنیٰ پور کا مقدس بودھ پجاری سرانجام دیگا۔ نینا بڑی خوش قسمت تھی کہ ایک ایسے بڑے سردار سے بیاہی جائے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا۔ اور سنا ہے، لوہار نے کہا کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار روپے لیا ہے۔ اب یہ سزا دینے والے بودھ بچ کہاں سو گئے ہیں۔ گاؤں کا لوہار بہت دیر تک اسی طرح کیا لاسے باتیں کرتا رہا۔ اور کہا لا سر جھکائے ایک چل میں سوت کے ٹانھے لگاتا رہا۔ اور جب لوہار وہاں سے رخصت ہو گیا تو نمبردار کا بیجا ہوا ایک آگیا اور اس نے کہا لا سے کہا کہ نمبردار کہتا ہے کہ کہا لا سے کہو کہ وہ نینا کی عروسی چل چل صبح تک تیار کر دے کیونکہ اخیں کل صبح ہی ادنیٰ پور جانا ہے۔ پرسوں نینا کی شادی بنے نینا کی شادی؛ کہا لا کے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو عروسی چل بنانے سے انکار کر دے اس نمبردار کے بچے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے نمبردار کی جان لے لے۔ اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی سے گر کر نیچے کی چٹان پر اپنا سر جٹھ دے لیکن اس نے بڑی مشکل سے آخر اپنے غصے اور ناامیدی پر قابو پا لیا۔ اور نمبردار

کے آدمی سے اشاروں میں کہا کہ وہ نمبردار کے حکم کی ضرورتیں کر گیا لیکن اس وقت اس کے پاس نقدی شمار نہیں ہیں وہ انہیں کھنیر سے لایا گیا اور کل صبح تک عروسی چل ضرور تیار کر دے گا۔ لیکن دوسرے دن جب نمبردار کا آدمی چل لینے کیلئے آیا تو کہا لانے والے جوڑ کر اس سے اشاروں میں کہا کہ عروسی چل تیار نہیں ہے۔ وہ کھنیر گیا تھا لیکن اسے نقدی تو کبھی سے ملے اور وہ بے نیل مرام واپس آ گیا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ عروسی چل کے تیار ہونے سے شادی میں رخصت پڑتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرے وہ بالکل ناچار تھا۔ جب نمبردار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے بدبخت کو ننگے کو بے نقط سنائیں، کہینہ بدعاش، گونگا وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے کیا؟ نہیٹ شیطان، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اگر عروسی چل نہ ہوگی تو دنیا کی شادی رک جائیگی وہ اس پاجی کو دنیا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزاح کھائے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مہنڈ کے لوگ تو کیا اس پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی بھی اس کے ناپاک ہاتھوں کا بنا ہوا جوتان پہنے لیکن ذرا وہ اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ ہوئے۔

کچھ دیر بعد اسی اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر کہا  
نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ امانتی پور کو جانے والے راستے کی طرف اکٹھے



ہو رہے ہیں۔ گھاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک سفر پر روانہ کرنے کے لئے، پھر کچھ عرصے کے بعد ڈھول، قزوں، لیزریوں اور مقدس سنتوں کی آواز کے درمیان نمبر دازینا اور اپنے عزیز واقارب کو لے کر اوانتی پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ساز و سامان سے لدی ہوئی خچریں اور قافلے کے لوگ تنگ راستے سے گزرتے ہوئے اگلے موڑ پر غائب ہو گئے۔

اس کے سینے سے ایک آنکلی، اچھا، تو یہ اس کی محبت کا انعام تھا۔ لیکن اسے اس سے بہتر انعام کی امید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنے بھڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ گٹھا ہوا تھا۔ کبالا نے غصے میں آکر اسے ایک دو ٹوکریں لگائیں لیکن غریب کھنڈا چلتا یا نہیں، بلکہ اپنے مالک کو اور اس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

کبالا نے گھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کھنڈا نے اپنی تھوکتنی اس کے دونوں پاؤں کے درمیان رکھ دی۔ پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈا کو اٹھایا اور اسے گلے سے پٹا کر پھوٹ چوٹ کر رونے لگا۔ غریب گونجے کا مٹھکا خیز رونا۔ لیکن اسے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا

ہاں اب اس کا خمیر اسے بار بار ملاست کر رہا تھا۔ کہ اس نے دنیا کیلئے  
 عروسی چیل کیوں نہ تیار کر دیا چھڑا اس کے پاس تھا اور فقرتی تار بھی۔ یہ  
 کیسی کھینہ حرکت تھی۔ آخر اس میں عینا کا کیا قصور تھا؟ اور اب کیا عینا  
 عروسی چیل پہنے بغیر ہی بیاہی جاتے گی۔ ننگے پاؤں، کتنی شرم کی بات  
 تھی، لیکن وہ تو اب بھی اس کے لئے ایک ایسا عمدہ عروسی چیل تیار کر سکتا  
 تھا کہ جس پر کنول کے پھولوں کا دھوکا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کیوں  
 نہ ابھی عروسی چیل تیار کرنے کیلئے بیٹھ جائے۔ وہ راتوں رات سفر کرتا ہوا  
 اگلی صبح اور انٹی پور پہنچ سکتا تھا اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں  
 سے عینا کے پاؤں میں چیل پہنا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے  
 چل بنانے کا تہیہ کر لیا۔ اور چھڑا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبالا نے چیل کو مکمل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق  
 کی سرخی بھی باقی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل اُٹھ  
 آئے تھے۔ اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد معلق  
 بنائے کھڑے تھے۔ تب دھیمے سے ایک اگڑائی لے کر رات  
 کی رانی جاگ اُٹھی۔ اور اس نے بادلوں کو اپنے گرد پا کر خوشی اور سستی  
 سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پازیب کی چھکار مجھبہ مند رکے  
 منگولی برب اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی

تھی۔ اور اس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نقرئی گنگن رومہ کرکوند جاتے تھے۔ ان ہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کھہار نے دیکھا کہ اوانتی پور کے پرچہ اور دشوار گزار راستے پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ دبائے کھنڈا کو ساتھ لئے جا رہا ہے۔



اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رات مہنڈر کی دادی میں ایک سمیت ناک چھنٹا ہوا طوفان آیا۔ وہ طوفان جس نے پہاڑ کے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اٹھیر چھینکا۔

مہنڈر کے ادھے گھر کی منقش چھت اڑ گئی۔ اور پراسنے بودھ مندر کا برج پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہواؤں کے برفانی خراشے چاندوں طرف ٹرالہ باری کرتے گئے۔ اور پھر ایک شدید ہولناک برفباری شروع ہوئی جس نے صبح ہوتے تک مہنڈر اور کھنڈر اور تاشی پور کے کھساروں کو برف کی ایک سفید گھبری چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور دوسرے دن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا بودھ سردار اپنی دلہن کو لیکر تاشی پور روانہ ہوا۔ اور برات شہنشاہیاں بجاتی ہوئی اوانتی پور

کی درمیانی بند گھاٹی میں سے گزری تو براتیوں نے دیکھا  
 کہ گھاٹی میں سفید برف پر دور تک قدموں کے نشان پڑے  
 ہیں۔ اور ایک بڑے تناور درخت کے نیچے ایک بد قسمت  
 راہ گیر مرا پڑا ہے۔ اس کا کتا اس کے پاؤں میں منہ دیئے  
 ہوئے اکر ڈگیا تھا۔

راہ گیر کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے  
 اورد وہ ان کی مضبوط گرفت میں کوئی چیز تھامے ہوئے تھا  
 ————— یہ ایک پتلا کاغذی چمڑے کا بنا  
 ہوا عودی چیل تھا۔ اور اس پر چاندی کی تاروں سے  
 کنول کے دو خوبصورت سفید پھول کڑھے ہوئے تھے



تلاش

وہ مصور تھا۔ اسے حسنِ مصوم کی تلاش تھی۔ اس کی تلاش میں وہ سرسبز وادوں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں گھومتا رہا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دور دورہ کے اکتے دُکے گاؤں میں اس کی تلاش کی۔ لیکن اسے نہ پاسکا۔ ایک دفعہ ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گلاب کے حسین پھول کو دیکھا کہ باڑ سے باہر جکی ہوئی شلخ پر بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مصور اس کی ایک تہی کا لہکا سانس لے رہا تھا۔ ہوا کا ایک لہکا سا جھونکا آیا۔ اور گلاب کی نازک پتیاں اُٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پر اس نے کنول کے  
 نوزائیدہ پھول کو دیکھا کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے  
 خوبصورت، نازک، زرد اور سپید اور برف کی طرح پاک و صاف  
 مصور نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا زنگھوں والا ڈبہ کھولا۔  
 یکایک جھیل کی خاموش سطح پر چوٹی چوٹی لہریں اٹھیں اور کنول کے  
 پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ انھوں نے اسے اپنی آغوش میں لے  
 لیا۔ اور پھر موت کے دلکش راگ گاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کسی "روں روں" کرتے ہوئے کنویں کے قریب  
 سے گزرتے ہوئے مصور کو گمان ہوتا کہ اس نے پانی بھرتی ہوئی  
 حینہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی تجسس  
 نگاہیں حینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا اور مین اس وقت کہ جب  
 پتیل کی گانگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر اچھل پڑتا۔ حینہ مصور کی  
 طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی۔ اسی مسکراہٹ جو گویا مصور سے کہہ رہی  
 تھی۔ "میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں" اور کبھی ایسا  
 بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصور نے سڑک کے کنارے  
 ایک خوبصورت بچے کو کھیلے ہوئے دیکھا اور ششک گیا۔ اور اس  
 نے بچے کو پیار سے بلایا۔

شریر نے مصدقہ کی طرف ایک چوٹا سا پتھر کھینچ مارا اور  
 پھر اپنی جسارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔  
 مصدقہ کا دل پریشان ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنی تلاش کو  
 جاری رکھا۔

وہ ایک صحرائی ہرنی کی طرح وحشی تھی اور آسمان پر اڑتی  
 ہوئی ابابیل کی طرح نغمہ ریز، وہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی  
 تھی۔ وہاں وہ ایک چٹان پر جو مسکینز کانی سے ڈھکی ہوئی تھی بیٹھ  
 جاتی..... گہرے سیاہ اور ریشم کی تاروں کی طرح نرم نازک  
 بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچوں  
 سے کھیلتی رہتی۔ جنگل کے گھنے سایوں میں کہیں کہیں سورج کی  
 کرنیں جھلکاتی رہتی تھیں مگر وہ کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے  
 بالوں میں چیرھ کے نیچلے جھومر کسی نامعلوم مسترت کے زیر اثر  
 غرق قرار تے رہتے تھے۔ کبھی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے  
 انہی جھومروں میں بیٹھ کر دلکش گیت سناتے تھے اور پھر کبھی  
 گیت سناتے سناتے غم جاتے۔ کیونکہ اب وہ چٹان پر بیٹھی



ہوئی گارہی تھی۔ وہ مسرت افزا نغمے بیٹربجولیں کے نغمے پتھوڑے  
 کیلئے میٹھی میٹھی لوریاں تھیں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گیت سنتے سنتے  
 ہوا قہقہہ جاتی۔ پھول غنودگی میں آکر اونگھ اونگھ جاتے اور سارا جگل کسی  
 نامعلوم چننے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصدور کا گزر اس جگل سے ہوا۔ وہ  
 چٹان پر بیٹھی تھی۔ اور اپنی گود میں ایک بھڑکے بچے کو لئے ہوئے  
 اس سے کھیل رہی تھی۔ وہ کبھی اُسے دودھ اوپر ہوا میں پھینک دیتی  
 اور پھر بائیں پسلا کو مہلاتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیتی۔  
 اور اسے نودھ سے اپنی چھاتی سے لگالیتی اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑتی۔  
 مصدور نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا اور بہت دیر تک اسے  
 دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا: "ادھر ————— میرے قریب آ  
 کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک نہایت خوبصورت تصویر  
 بناؤں گا۔"

وحشی لڑکی نے حیران لگا مہل سے مصدور کی طرف دیکھا  
 پھر اس نے ایک نحیف سی جنبش کے ساتھ سر کو جھٹک  
 دیا۔ اور مصدور کے قریب آکر بیٹھ گئی۔



پوچھ سکتی ہوں۔

لیکن چرواہے نے پھر سوال کیا۔ اور کیا تمہیں یہ پتہ بھی نہیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے ؟

”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس نے مجھے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دیگا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے ؟“

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے جھک گیا۔ آہ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمہاری ہی تصویر ہے

۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ بیوقوف مصوم لڑکی۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔

تم کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے ؟ کیوں ؟ اوہ۔۔۔۔۔ !

لڑکی پریشان ہو گئی اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود نہنسی۔ پھر ریوڑ کو لے کر وہ آہستہ آہستہ جھل کی طرف چلی گئی۔

مصور نے اس کی طرف دیکھ کر رک رک کر کہا۔  
”تم آج دیر سے آئی ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہو؟  
ہاں مجھے آج دیر ہی ہو گئی۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصور کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی تھی

حقی: راستے میں مجھے حسن ملا تھا۔ اس نے مجھے پوچھا کہ کیا وہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے؟ میں نے جواب دیا مجھے پتہ نہیں کیا یہ میری تصویر ہے؟ کیا میں اس تصویر میں ہوں؟

• ہاں، لیکن تم ایسا کیوں پوچھتی ہو؟

• اوہ ————— یونہی ————— لیکن میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ تم میری تصویر کیوں بنا رہے ہو؟

مصور بے چین ہو گیا۔ اس نے لیٹے کی طرف دیکھا۔ اور پھر چپ ہو رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اس کے ہاتھ تصویر پر جھٹے ہی دے رہے۔

شام کے بڑھتے ہوئے سالیوں میں گھاؤں جاتے ہوئے راستے میں اُسے حسن مل گیا۔

• کیا تم نے اس سے پوچھا تھا؟

• ہاں..... اس نے کہا وہ میری ہی تصویر ہے؟

• لیکن..... کیوں؟

• اس نے اور کچھ نہیں کہا۔

• آہ۔ میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔ حسن نے لیٹی

کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اسے تم سے محبت ہے، لیٹی اب تم سے

محبت ہے۔ تم بہت حسین ہو لیکن کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کس قدر حسین ہو؟ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، میری محسوس لیسے محبت، کیا تمہیں پتہ ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں؟

جیسے یسلی کی روح کا ذرہ ذرہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا۔ کوئی اس کے دل کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا اور چلا چلا کر کھڑا تھا۔ اٹھ بھکان دروازہ کھول دے کہ یہ معبد میرے بغیر سونا پڑا ہے۔ کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ ایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور پھر اسے ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے اور لاکھوں کرداروں پہاڑی سمندر کی لہروں کی طرح ہچکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ طوفان، بادل کی گرج، بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھاریں اور لاکھوں گھنٹیوں کا پُر شور آواہن، یسلی یک لخت ڈر گئی۔ ایک عجیب خوف و ہراس سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اس نے تیزی سے اپنا ماتہ چھڑایا اور بھاگ گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنسو بار بار آئے۔ لیکن نیند ایک دنہی نہیں۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر وہ جھیل کے کنارے گئی اور دیر تک اپنا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک ہی اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین بالوں کو صاف کرتی رہی۔ جب وہ جھیل کے کنارے سے اٹھی تو اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ایک انگڑائی لے کر منہ ہی، ایک عیب منہ ہی، صبح کی پہلی کرنوں میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے۔

جھیل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اس نے منہ کے پھولوں کا ایک گچھا دیکھا۔ اس نے اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔ اب اس کی نگاہوں میں نئی چمک تھی۔ اور لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ جب مصور نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں پوچھا۔ "تم اسے کہاں چھوڑ آئیں؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی۔

مصور اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکی کے قریب گیا۔ اور اس کے شانے زور سے ہلا کر کہنے لگا۔ "آہ یہ تم نے کیا کر دیا، تم نے اُسے کہاں چھوڑ دیا۔"

لڑکی کچھ نہ سمجھی، لیکن مسکرا دی۔

مصور گلو گھر لہجہ میں چلایا۔ "وہ کہاں ہے سچ بتاؤ وہ کہاں

ہے! میری لیلے..... کم غبت لڑکی!.....“

پھر یک لذت مصور نے اس کے شانے چوڑ دیئے۔ اس نے حزی اور شاید عیشگیں گنگا ہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کھینچ دیکھا۔ آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اُسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا۔ پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے آہستہ سے اس نے چوکھٹے کو تہ کیا۔ رنگوں اور برشوں کے ثبے کو سنبھالا اور لڑکی پر ایک نگاہ تک ڈالے بغیر مغرب کی طرف مڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے۔ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی۔ اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی: ”ست جاؤ، آہ اجنبی مصور ست جاؤ.....“

لیکن مصور نے ایک مرتبہ بھی پیچے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکانے ہوئے جھگل کی مغربی سمت کو جا رہا تھا۔ لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصور کھینچ کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ لیتی تھی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ہوا چڑو کے نیلے تپوں میں گورتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ جہیں دو جھگل میں کوئی بیڑ کا پھلڑا ہوا بچہ چلا رہا تھا۔ بنخشے کے پولوں کا گچھا لیلے کے پاؤں میں گرا پڑا تھا۔

# ہماری کتابیں پیاری کتابیں

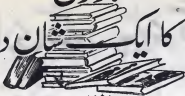
زرگاؤں کی انی کرشن چندہ ۶/۱۰	محبت ایک کائنات کوشن چندہ ۱۰/۱۰
چند کی چاندنی ۱۰/۰	تہا چاند ۱۵/۰
پیاری خوشبو ۱۰/۰	کئی پیٹنگ ۱۸/۰
بس مینی مال ۱۰/۰	ملین ۱۳/۵۰
نظائے ۱۰/۰	شرمیل ۲/۵۰
سپنوں کے پھول ۱۰/۰	امرئیل صحت جنتی ۱۵/۰
سپنوں کے قیدی ۱۰/۰	ایا بسنت سکھی (۱۰ حصہ) ۱۳/۰
آئیے اکیلے ہیں ۱۵/۰	تو چاند میں سمند امرتارجم ۱۵/۰
ایک عورت ہزار دنیائے ۱۵/۰	ساڈا یا با جناح ڈاکٹر جارج ۱۵/۰

بکے انو طبوعاد

بک کا زر چوک فیصل شہید بازار گلان حلیم



# ناولوں کا ایک شاندار انتخاب



<p>زرگاؤں کی رانی</p> <p>کوشن چندر ۶/۷۵</p>	<p>آہستہ آہستہ اکیلے ہیں</p> <p>کوشن چندر ۱۵/-</p>	<p>ایک عورت ہزار دلوں کے</p> <p>کوشن چندر ۱۵/-</p>
<p>پیار کی خوشبو</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>مسنی تال</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>چند اکی چاندنی</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>
<p>پسوں کے قیدی</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>نظارے</p> <p>کوشن چندر ۱۲/-</p>	<p>پسوں کے پھول</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>

مک کارنر فون ۲۸۸۵  
چوک فصیل شہید جہلم شہر

# کرشن چندر کی لافاغی کتابیں

- (آئینے آکیلے ہیں) ————— ۱۵ روپے
- چندر کی چاندنی ————— ۱۰
- پیار کی خوشبو ————— ۱۰
- مِسِ نشی تال ————— ۱۰
- زرگاؤں کی رانی ————— ۲۰۷۵
- (یک عورت بنار دیو آنے) ————— ۱۵
- سپنوں کے پھول ————— ۱۲۰۵۰
- نظارے ————— ۱۰
- سپنوں کے قیدی ————— ۱۲
- ہانگ کانگ کی حسینم ————— ۹
- شالو ————— ۱۵

تبک کارنی چوک فیصل شہید روٹن نمبر ۸۵۸۵۸۵۸۵

# ہمارے کتابیں

۱۰/-	چند اکی چاندنی	۲۵/-	شیریں سلطان بیوہ
۱۰/-	پیاد کی خوشبو	۲۵/-	تاریخ جد و جہد ازادی
۱۰/-	مس مینی تال	۱۵/-	ساڈا بابا جناح
۱۲/۵۰	بقدرے	۱۵/-	صحت خجانی
۱۰/-	پسوں کے پھول	۱۲/-	تسوی سی پانگل
۱۲/۵۰	پسوں کے قیدی	۱۸/-	محبت ایک کائنات
۶/۷۵	زر گاؤں کی رانی	۱۵/-	تینا چاند
۱۵/-	آپٹھے کیلے ہیں	۱۸/-	کٹی چنگ
۱۵/-	ایک عورت ہزار دیوانے	۱۲/۵۰	بین
۱۰/-	قسمت کے مجید	۱۲/۵۰	شہریل
۱۵/-	آچاند میں سمندر	۱۳/-	آیا بنت سکی

تمام کتابیں بجلد اور عمدہ سرورق سفید کاغذ پر چھپ کر تیار ہیں

پیشرو، پاکستان پبلشرز اینڈ  
جنرل آرڈر سپلائرز  
چوک فیصل شہید

ہیکاری

بین بازار جہلم فون ۲۸۸۵